ISSN: 2581-5482

سہ ماہی

ادبی نشیمن لکھنؤ

مارچ تا مئی ۲۰۲۶ء

پیئر ریویوڈ جرنل

ADBEE NASHEMAN

Peer Review Journal



قیمت ۴۰/روپے

ایڈیٹر ڈاکٹر سلیم احمد



ادبی نشیمن کے دفتر میں محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ میں ترقی پا کر انفارمیشن آفیسر بنے
محمد اقبال خاں کو استقبالیہ اور اعزاز سے نوازا گیا۔



اسلامک سینٹر آف انڈیا میں فضل حق خیرآبادی کے اعتراف میں داستان گوئی کی محفل میں
داستان پیش کرتے ہوئے فرزانہ مہدی اور شہزاد رضوی۔

مارچ تا مئی ۲۰۲۶
ISSN: 2581-5482
جلد : ۹ شمارہ: ۲

سہ ماہی ادبی نشیمن لکھنؤ

سرپرست
ڈاکٹر عامر قدوائی (کویت)
مدیر
ڈاکٹر سلیم احمد
adbeenasheman@gmail.com
9415693119 8707260591
مدیر اعزازی
ڈاکٹر شاہد حبیب
8539054888
سرکولیشن منیجر
محسن عظیم انصاری
9451300431

ADBEE NASHEMAN

قیمت

اس شمارے کی قیمت	:	۴۰ روپے
دوسالہ ممبرشپ مع رجسٹرڈ ڈاک	:	۴۵۰ روپے
بیرونی ممالک (ہوائی جہاز ڈاک)	:	25 $ (امریکی ڈالر)
لائف ٹائم ممبرشپ	:	پانچ ہزار روپے
لائبریری/ادارہ کے لئے	:	۶۵ روپے فی شمارہ

ترسیل زر (منی آرڈر) کا پتہ

سہ ماہی ادبی نشیمن

168/C-544 الماس باغ، ہردوئی روڈ، لکھنؤ

Bank Detail

Name : Adbee Nasheman
Bank : Indian Bank, Lucknow
Branch : Balaganj
A/c No : 50489096237
IFSC : IDIB000L558

Address

Editor Urdu Quarterly
ADBEE NASHEMAN
544-C/168,Almasbagh
Hardoi Road, Lucknow-03

www.adbeenasheman.com
E-mail: adbeenasheman@gmail.com

اس دور میں تنہا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ اپنے دم پر ادبی رسالے کو مسلسل جاری رکھ سکے اس لئے اردو سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے تقاضے کے پیش نظر کیو آر کوڈ شائع کیا جا رہا ہے تا کہ جو لوگ مالی تعاون/خریدار بننا چاہتے ہوں وہ اس پر رقم بھیج سکتے ہیں۔

ADBEE NASHEMAN
SCAN & PAY
UPI ID : adbeenasheman@indianbk

☆ ادبی نشیمن کو RNI سے رجسٹریشن سرٹیفکیٹ Adbee Nasheman کی اسپیلنگ کے ساتھ ملا ہے۔ اس لیے غلط ہونے کے باوجود مجبوراً یہی اسپیلنگ ہر جگہ استعمال کی جا رہی ہے۔

☆ ادبی نشیمن میں شائع ہونے والے خیالات قلمکاروں کے اپنے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

☆ کسی بھی قسم کی قانونی چارہ جوئی کا اختیار صرف لکھنؤ کی عدالتوں کو حاصل ہے۔

پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر احمد رشیق نے نعمانی پرنٹنگ پریس، بارودخانہ، گولہ گنج لکھنؤ سے چھپوا کر 168/544-e، الماس باغ ہردوئی روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔
ایڈیٹر: ڈاکٹر سلیم احمد

فہرست سہ ماہی ادبی نشیمن، لکھنؤ مارچ تا مئی ۲۰۲۶ء

آغاز

	حمد باری تعالیٰ	واحد نظیر	۳
	نعت شریف	عبرت مچھلی شہری	۳

اداریہ

	نظریہ	ڈاکٹر سلیم احمد	۴

مضامین

۱	نعت گوئی میں مخمور کاکوری کی خدمات	پروفیسر ثوبان سعید/ ڈاکٹر وصی احمد اعظم انصاری	۵
۲	وقت وزماں: مولانا آزاد کی فکری جہات	ڈاکٹر مجاہد الاسلام	۱۰
۳	ذکا ابن وحید: ایک سخنور پیارا سا	ڈاکٹر ذاکر حسین ذاکر	۱۷
۴	نسیم زاہد: شخص اور شاعر	ڈاکٹر عامر قدوائی	۲۴
۵	میں تنہائیوں کی گفتگو ہوں: ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی	اشتیاق سعید	۲۶
۶	صحافت کی اخلاقیات اور خبروں کے اقدار	ڈاکٹر مصطفیٰ علی	۳۱
۷	صفدر امام قادری کی کالم نگاری	محمد اویس سنبھلی	۳۶
۸	بزم اردو سیتاپور: نصف صدی کا روشن سفر	عبدالقدوس ہاشمی	۳۸
۹	کلیم اللہ کلیم دوست پوری کی غزل گوئی	ڈاکٹر احسان عالم	۴۱
۱۰	عمیق حنفی کی نظم نگاری	مقصود خاں علیگ	۴۴
۱۱	اختر آزاد کا ناول ''جلتا پہاڑی سیارہ'' ایک جائزہ	محمد طیب جمشید پوری	۴۶
۱۲	ڈاکٹر بدر محمدی کی تبصرہ نگاری (بعد از مطالعہ کی روشنی میں)	ڈاکٹر ریحان احمد قادری	۴۹

منظومات

۱۳	غزل	ڈاکٹر رؤف خیر	۹
۱۴	غزل	مصداق اعظمی	۲۳
۱۵	غزل	جبیں نازاں	۴۰
۱۶	غزل	فرحانہ نازنین	۴۳
۱۷	غزل	دلشاد دل سکندر پوری	۴۸
۱۸	غزلیں	مقصود خاں علیگ/ مدہوش بلگرامی	۵۳
۱۹	'پسِ دیوار خواب	شعیب ندیم	۵۴
۲۰	اس شب بھی آرام نہیں/ نذرِ غالب	سشانت چٹوپادھیائے سفیر/ ڈاکٹر نفیس بانو	۵۵
۲۱	وفا/ ہلال عید	سنبل فاطمہ/ نیاز جیراجپوری	۵۶

افسانے

۲۲	ڈائمنڈ رنگ	وسیم احمد صدیقی	۵۷
۲۳	حق تلفی	ڈاکٹر سلیم احمد	۵۸
۲۴	شونیہ کا رقص	سید تحسین گیلانی	۵۹

افسانچے

۲۵	بٹیارانی	ابراہیم نثار اعظمی	۶۰

تبصرے

۲۶	شیشے کے اس پار	تخلیق: ڈاکٹر عافیہ حمید/ مبصرہ: ام ایمن	۶۱
۲۷	والد کے خطوط بیٹے کے نام	مرتب: حاجی سید مفید الدین قادری/ مبصر: ساجد خیر آبادی	۶۲
۲۸	خوشبوئے ریحان	تالیف: ڈاکٹر ریحان احمد قادری/ مبصر: انس مسرور انصاری	۶۴

حمد باری

مخفی ہو یا ہویدا ، اے مالکِ حقیقی
ہر شے میں تیرا جلوہ ، اے مالکِ حقیقی

وہ حرف وہ نوا دے، وہ صورت وہ صدا دے
جو ہوں ثنا کو زیبا ، اے مالکِ حقیقی

ابرِ سیہ نے پھر سے سورج کو ڈھک لیا ہے
باطل کا سر ہے اونچا ، اے مالکِ حقیقی

میں ہوں خطا سراپا ، لیکن مرا وتیرہ
لاتقنطوا پہ تکیہ ، اے مالکِ حقیقی

مانا ترے کرم کے لائق نہیں ہوں لیکن
بندہ ہوں تیرا بندہ ، اے مالکِ حقیقی

دنیا و آخرت میں واحد نظیرؔ کو بھی
ہونے نہ دینا رسوا ، اے مالکِ حقیقی

☆☆☆

واحد نظیرؔ
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ موبائل:9990386833

نعت

واللہ کیا وہ نازشِ خلقت ہے بے مثال
محبوبِؐ رب کی شانِ ولادت ہے بے مثال

تکیہ چٹائی چھوٹا سا مٹّی کا اک گھڑا
سلطانِ کائنات کی غُربت ہے بے مثال

کردار ان کا کرتا ہے تبلیغ دین کی
سرکارؐ کا طریقۂ دعوت ہے بے مثال

طائف کو تو نے اپنی دُعا سے بچا لیا
تیرا کرم تو پیکرِ رحمت ہے بے مثال

بیٹی کو عمر بخشی تو بیوہ کو آبرو
سرکارؐ جانتے تھے کہ عورت ہے بے مثال

اے بچّو! ماں کے قدموں کے نیچے بہشت ہے
شاید اسی لیے تو یہ جنّت ہے بے مثال

بابا کے گھر چلاتی ہیں چکّی وہ یاخدا
جنّت کی شاہزادی کی عظمت ہے بے مثال

دینِ نبیؐ کو خون جگر کا پلا دیا
ہیں سُرخرو خلیفہ خلافت ہے بے مثال

کلمے کے پھول گوندھے ہیں سانسوں کی ڈور میں
عبرت یونہی نہیں مری مدحت ہے بے مثال

☆☆☆

عبرت مچھلی شہری
موبائل:7618034824

نظریہ



ادبی وصحافتی دنیا میں رسائل و جرائد کا کردار ہمیشہ سے نہایت اہم رہا ہے۔ اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے ادبی نشیمن نے گزشتہ برسوں میں متعدد اہم ادبی شخصیات پر خصوصی شمارے شائع کیے، جنہیں قارئین نے بے حد پسند کیا اور بھرپور پذیرائی بخشی۔ اسی تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے اب ادبی نشیمن نے عہدِ حاضر کی مایہ ناز افسانہ نگار و ناول نگار مسرور جہاں کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک خصوصی شمارہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ شمارہ (جون تا اگست 2026) مسرور جہاں کے نام معنون ہوگا، جس میں ان کی تخلیقی جہات، فکری تنوع اور ادبی خدمات کا ہمہ جہتی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

ادب کے ساتھ ساتھ صحافت بھی زبان و ثقافت کی بقا میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ اردو زبان میں شائع ہونے والے روزناموں میں "راشٹریہ سہارا" ایک نہایت معتبر اور مقبول اخبار تھا جو سہارا انڈیا پریوار کے زیرِ اہتمام پابندی کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ یہ اخبار اپنی غیر جانبدارانہ رپورٹنگ، سنجیدہ صحافت اور ادبی وثقافتی شعور کے باعث ملک گیر سطح پر مقبول تھا۔ دہلی، لکھنؤ، پٹنہ، ممبئی، کولکاتہ، بنگلور، حیدرآباد، گورکھپور اور کانپور جیسے بڑے شہروں سے اس کی اشاعت اس کی وسعت اور اثر پذیری کی واضح دلیل تھی۔ راشٹریہ سہارا کی توجہ نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والی سیاسی وسماجی تبدیلیوں پر ہوتی تھی۔ بلکہ حالاتِ حاضرہ پر مبنی تجزیے، ادب وشاعری کے لیے مخصوص صفحات اور تہذیبی وثقافتی مباحث بھی اس کی شناخت کا حصہ تھے۔ مگر افسوس کہ اردو صحافت کا یہ مضبوط ستون بتدریج کمزور ہوتا گیا اور بالآخر ۹ رجنوری 2026 کو اس کے تمام ایڈیشن کے بند ہونے کی خبر نے اردو دنیا کو غم واندوہ میں مبتلا کر دیا۔ ممبئی، بنگلور اور کولکاتہ کے ایڈیشن پہلے ہی بند ہو چکے تھے، مگر بقیہ اشاعتوں کے اچانک خاتمے نے گویا اردو صحافت کے تابوت میں آخری کیل کا کام کیا اور اس طرح اردو صحافت کے ایک روشن دور کا خاتمہ ہو گیا۔

اس اخبار کی ترقی اور شناخت میں اس کے اولین گروپ ایڈیٹر عزیز برنی کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔ ان کا مقبول کالم "ضمیر کی آواز" قارئین کے دلوں کی آواز بن چکا تھا۔ ان کی علاحدگی کے بعد یہ ادارہ کمزور ہوتے ہوتے اس سطح پر پہنچ گیا کہ تقریباً آکسیجن سپورٹ پر آ گیا۔ اب جب کہ اس کی اشاعت مکمل طور پر بند ہو چکی ہے تو نہ صرف اردو قارئین مایوسی کا شکار ہیں بلکہ اس سے وابستہ صحافیوں اور دیگر عملے کے اہلِ خانہ کے لیے معاشی مسائل بھی سنگین صورت اختیار کر گئے ہیں۔ یہ حقیقت بھی قابلِ ذکر ہے کہ سہارا شری سبرت رائے کے دورِ حیات میں، خسارے کے باوجود اردو اخبارات کی اشاعت جاری رہی، یہ ان کی اردو دوستی اور ثقافتی شعور کا بین ثبوت تھا۔ ان کے انتقال کے بعد سے ہی خطرات کے بادل منڈلانے لگے تھے اور اندیشہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ کہیں اس کا انجام بھی "روزنامہ قومی آواز" کی طرح نہ ہو۔ اس صورتحال تک پہنچنے سے روکنے کے لیے اخبار نے اپنی ادارتی پالیسی کو داؤں پر لگانا شروع کر دیا اور اصحابِ نظر نے اس میں بتدریج ایک مخصوص نظریے کی طرف جھکاؤ کو محسوس کیا، اس کے باوجود کچھ لوگ اس کی تجہیز وتکفین کا سامان کرتے ہے اور بدقسمتی سے وہی ہوا، جس کا ڈر تھا۔ اردو قارئین اور دانشوروں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ راشٹریہ سہارا اردو کے بند ہونے سے صرف ایک اخبار کی اشاعت نہیں رکی بلکہ اس سے وابستہ صحافیوں اور عملے کے گھروں کے چراغ بھی مدھم ہو گئے۔ برسوں کی محنت اور وابستگی کے بعد یکا یک روزگار چھن جانے سے ان خاندانوں کے سامنے فاقہ کشی اور غیر یقینی مستقبل کا بھیانک سایہ منڈلا رہا ہے اور ان کی آنکھوں میں کل کی روٹی کی فکر ایک اذیت ناک سوال بن کر رہ گئی ہے۔ اس سوال کی طرف بھی ارباب حل وعقد کی توجہ جانی چاہیے۔

نئے سال کا آغاز ہی اردو دنیا کے لیے کئی حوالوں سے مایوس کن ثابت ہوا۔ ایک طرف راشٹریہ سہارا کی بندش کا صدمہ تھا تو دوسری طرف اردو ادب وصحافت کی کئی ممتاز شخصیات اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ ۲۵ رجنوری کو مترنم لب ولہجہ کے حامل بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر طاہر فراز، ۲۸ رجنوری کو معروف ناظم، شاعر اور صحافی رئیس انصاری، اس کے علاوہ سینئر صحافی و مزاح نگار اسد رضا (سابق گروپ ایڈیٹر، روزنامہ راشٹریہ سہارا)، ضیاء رحمانی، احمد وصی اور ضیاء علوی کی وفات نے اردو دنیا کو سوگوار کر دیا۔ ادبی نشیمن کا کنبہ ان تمام مرحومین کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے اور بارگاہِ ایزدی میں ان کی مغفرت، درجات کی بلندی اور پسماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔ ایسے کٹھن اور نازک دور میں ادب وصحافت سے وابستہ افراد کی ذمہ داری مزید بڑھ جاتی ہے کہ وہ نہ صرف زبان وادب کی شمع روشن رکھیں بلکہ نئی نسل کو بھی اس سے جوڑنے کی سنجیدہ کوشش کریں۔ ادبی نشیمن اپنی ادبی کاوشوں کے ذریعے اسی عہد کی تجدید ہے کہ اردو زبان و ادب کی خدمت کا یہ سفر ہر حال میں جاری رہے۔

ادبی نشیمن کا تازہ شمارہ اب آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس کے حوالے سے آپ کے بیش قیمت تاثرات کا انتظار رہے گا۔ شکریہ

ڈاکٹر سلیم احمد

نعت گوئی میں مخمور کاکوروی کی خدمات

پروفیسر ثوبان سعید (پروفیسر، شعبۂ اردو، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ)
ڈاکٹر وصی احمد اعظم انصاری (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ)

عصر حاضر میں لکھنؤ کے ادبی فلک پر جو ستارے اپنی منظوم و منثور تخلیقات سے ضیاء بکھیر رہے ہیں، ان میں سے ایک بہت ہی مشہور نام مخمورؔ کاکوروی کا ہے۔ آپ لکھنؤ کے مشاعروں، سیمیناروں اور ادبی نشستوں کی برابر زینت بنتے رہے ہیں۔ مخمورؔ کاکوروی نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس بات کی شہادت ان کی وہ چھ رشحات قلم (۱۔ میر نذر علی دردؔ کاکوروی حیات و خدمات۔ ۱۹۹۷ پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ، ۲۔ ایک غزل۔ ۲۰۰۷ (اشرف مالوی) ترتیب، ۳۔ مضامین دردؔ کاکوروی۔ ۲۰۰۹ مضامین کا مجموعہ، ۴۔ کلام سخنؔ (منشی عبدالکریم سخنؔ کاکوروی)، ۵۔ خامہ فرسائی۔ ۲۰۱۵ تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ، ۶۔ غزل جیسی گفتگو۔ ۲۰۱۹ شعری مجموعہ) ہیں جو زیور طبع سے آراستہ و پیراستہ ہو کر اہل علم و ادب سے داد تحسین حاصل کر رہے ہیں۔ مخمورؔ کاکوروی کے نعتیہ فنکاری کا شہکار 'دیار سبز گنبد میں' ہے جو قاری کو مذہبی تقدس کے ہالہ میں لے کر ان کے اذہان و قلوب کو معطر کر رہا ہے۔ یہ نعتیہ مجموعہ کلام سرور کائنات حضور اکرم محمد مصطفیٰ ﷺ کی زندگی اور ان کی تعلیمات کے ساتھ ہی ساتھ صحابہ کرام کی خدمات اور دیار مکہ و مدینہ کی روحانی فضا کو چہار اطراف میں بکھیر رہا ہے۔ انہوں نے اپنے اس نعتیہ مجموعہ کلام کا انتساب حسان الہند محسنؔ کاکوروی کے نام کیا ہے۔ حسان الہند محسنؔ کاکوروی اردو ادب کے سب سے بڑے نعتیہ قصیدہ گو ہیں، اسی سے اس نعتیہ مجموعہ کلام کی ادبی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس نعتیہ مجموعہ کلام میں منقبت کے اشعار موتی کی طرح جا بجا پروئے گئے ہیں جو دبستان لکھنؤ کی پاسداری کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ڈاکٹر فرقان علی مخمورؔ کاکوروی کا تعلق دبستان لکھنؤ کے بہت ہی مشہور و مقبول خطہ کاکوری سے ہے جہاں علم و ادب کی شمع برابر روشن رہی ہے۔ دیار کاکوری میں منعقد ہونے والے مشاعروں اور ادبی نشستوں کے علاوہ خانقاہوں میں منعقد ہونے والی محفلوں نے بھی یہاں کے قلمکاروں کی آبیاری کی ہے۔ یہاں پر شعر و شاعری کے چرچے گھروں میں ہوتے رہتے ہیں۔ اردو کے مشہور و معروف شعرا و ادبا میں شیخ کمال الدین سعدیؔ (جن کو شمالی ہند کا پہلا ریختہ گو شاعر کہا جاتا ہے)، شاہ تراب علی قلندر، محسنؔ کاکوروی، منشی سجاد حسین، نورالحسن نیرؔ، نادرؔ کاکوروی، دردؔ کاکوروی، سہیلؔ کاکوروی، ابراہیم علوی اور مخمورؔ کاکوروی کے نام برابر ادبی حلقوں میں موضوع گفتگو رہے ہیں۔ کلام موزوں خاص کر نعتیہ کلام کے معروف و مقبول قلم کار شیخ کمال الدین سعدیؔ، شاہ تراب علی قلندر، محسنؔ کاکوروی، اردو کے مشہور و مقبول و بے باک صحافی اودھ پنچ کے اڈیٹر اور عظیم المرتبت مزاحیہ ناول نگار منشی سجاد حسین، نورالغات کے تخلیق کار اور محسن کاکوروی کے صاحب زادے نورالحسن نیرؔ اور جعفر علی شیونؔ جس نے رجب علی بیگ سرورؔ کی 'فسانہ عجائب' کے جواب الجواب 'طلسم حیرت' تحریر کی، اسی ادبی خطے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان عظیم شخصیتوں نے اپنے خامہ زرنگار سے قصر ادب اردو میں جو شمع جلائی ہے اس کی ضیاء سے اردو کے فنکار مستفیض ہو رہے ہیں۔ اتفاق سے مخمورؔ کاکوروی بھی اسی چراغ کی لو کو رنگ و روغن عطا کر کے اسے مزید تیز کرنے کے لئے کوشاں ہیں جسے شاہ تراب علی قلندر، محسنؔ کاکوروی، اور دیگر شعراء نے روشن کیا ہے۔ مخمورؔ کاکوروی کو شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ ابتدا میں وہ کاکوری کے گرد و نواح میں ہونے والے نعتیہ مشاعروں میں مشاعرہ سننے جایا کرتے تھے، اسی شوق نے انہیں شاعری کے کمال تک پہنچا دیا۔ انہوں نے اپنی شاعری کی ابتدا نعتیہ کلام سے کی تھی۔ پہلے پہل انہوں نے اپنا کلام میلاد کی محفل میں پیش کیا تھا۔ اس کے متعلق وہ رقمطراز ہیں:

> ''کاکوری کے گرد و نواح میں نعتیہ مشاعرے برابر ہوا کرتے تھے اور میں بڑے ذوق و شوق سے مشاعرے سننے کے لئے جاتا تھا۔ میرے محلے کی مسجد منصب علی شاہ میں ۱۱ ربیع الاول کو ہر سال میلاد کی محفل اور مقامی شعرا کا چھوٹا موٹا نعتیہ مشاعرہ منعقد ہوتا

تھا۔پہلی بار اسی موقع پر میں نے تین نعتیہ شعر پیش کئے
جس کیلئے قصبہ کے شعراء سلطان باسط علوی بیکسؔ
کاکوری، منشی ظہیر الدین ظہیرؔ کاکوروی، عبدالرزاق
کاکوروی، انیس احمد گوہرؔ کاکوروی اور عبدا لصبور
اسیرؔ کاکوروی وغیرہ نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔''
(دیارسبز گنبد میں، مخمور کاکوروی، ص ۳۲)

مخمورؔ کاکوروی کو نظم ونثر میں یکساں قدرت حاصل ہے۔انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر اور 'غزل جیسی گفتگو' (غزلوں کا مجموعہ) کے تخلیق کار ہیں۔ان کا یہ پہلا مجموعہ ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا اور ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے۔اس شعری مجموعہ میں غزل کے علاوہ حمد، نعت پاک، دوہا، نذرانہ عقیدت اور قطعات شامل ہیں۔انہوں نے بارگاہ خداوندی میں عقیدت کا نذرانہ بڑے ہی ادب واحترام کے ساتھ پرخلوص انداز میں پیش کیا ہے۔وہ وحدہٗ لاشریک اور کن فیکون پر مکمل یقین رکھتے ہیں۔وہ خدا کی بنائی ہوئی کائنات، مناظر قدرت، گل وبلبل اور چرندو پرند وغیرہ کا ذکر کچھ اس انداز سے منظوم پیرائے میں کرتے ہیں ؎

آسماں تیرا، زمیں تیری، سمندر تیرا
چاند تارے، گل وبلبل، یم وگوہر تیرے
تیری قدرت کا بیاں ہو نہیں سکتا ہم سے
وادیاں، جھیلیں، سبھی دل نشیں منظر تیرے

مخمورؔ کاکوروی خدائے ذوالجلال کے سامنے اپنی زندگی کا احتساب کرتے ہیں اور اللہ رب العزت سے دعا گو ہیں کہ اے خدا تو مجھے اس دنیا میں نیک کام کرنے کا موقع عنائت فرما تا کہ میں جب میں اس دنیا سے رخصت ہوؤں تو لوگ میرا نام عزت سے لیں اور زمانہ اس کی مثال دے۔یہ قوت وطاقت تو تیرے پاس ہے کہ جسے تو چاہے جنت نصیب کرے یا جہنم میں ڈال دے ؎

اللہ! زندگی میں گزاروں کچھ اس طرح
دنیا سے جب اٹھوں تو زمانہ مثال دے
مخمورؔ ہے یہ اس کریمی پہ منحصر
جنت عطا کرے کہ جہنم میں ڈال دے

یہاں پر مخمورؔ کاکوروی کی نظم خاص کر شخصی یا تعزیتی نظموں کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔فنکار ادب مخمورؔ کاکوروی کی جن فنی شخصیات سے ادبی، ذاتی اور ذہنی مناسبت رہی یا جن کے زیر سایہ انہوں نے زبان وادب اور تہذیبی وانتظامی امور کے اسرار ورموز کی باریکیوں سے استفادہ کیا، ان کی وفات پر شخصی نظمیں تخلیق کر کے ان کو نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔انہوں نے جو شخصی نظمیں لکھی ہیں وہ شعری وادبی فنکاری کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہیں۔انہوں نے اردو میں شخصی نظمیں لکھ کر اس روایت کو مزید مستحکم کیا ہے۔ان کی زیادہ تر نظمیں اردو کے شاعر وادیب کے کارناموں سے متاثر ہوکر صفحہ قرطاس کی زینت بنیں وہ اس طرح سے ہیں نذر میرؔ، نذر عرفانؔ صدیقی، نذر ولی الحق انصاری، نذر والی آسی، نذر رخمارؔ بنکوی، نذر محمود الٰہی، نذر گوہرؔ کاکوروی، نذر رشیمہ رضوی۔مثال کے طور پر پروفیسر محمود الٰہی جو اردو کے نامور محقق، ناقد اور گورکھپور یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو کے عہدے پر فائز تھے، کو اتر پردیش اردو اکادمی کا چیئر مین بنایا گیا۔انہوں نے اردو اکادمی کے چیئر مین کی حیثیت سے اردو زبان وادب کی ترقی اور ترویج واشاعت کے لئے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔نذرانہ عقیدت کے یہ چند اشعار ؎

وہ خدمت اردو کو سمجھا کئے فرض اپنا
اس فرض سے کب غافل محمود الٰہی تھے
اب ہو گئے ماضی کا اک قصہ پارینہ
اردو ترا مستقبل محمود الٰہی تھے
مخمورؔ بھلا پانا آسان نہیں ان کو
سکھ دکھ میں ترے شامل محمود الٰہی تھے

نعت گوئی کو شاعری کے زیور کا نگینہ کہا جاتا ہے۔نعت گوئی کا فن بظاہر جس قدر آسان نظر آتا ہے، بباطن اسی قدر مشکل ہے۔ناقدین ادب اس کو مشکل ترین صنف سخن میں شمار کرتے ہیں۔نعت گوئی کا حق وہی ادا کر سکتا ہے جو جذبہ عشق رسولؐ سے سرشار ہو اور فن شاعری کی باریکیوں سے بھی واقف ہو۔یہ ایسا فن ہے جس میں حب رسولؐ کا جذبہ موجزن ہوتا ہے اور الفاظ کی ٹھوڑی سی لغزش سے دائرہ اسلام سے خارج ہونے کا سبب بھی بن جاتا ہے۔مخمورؔ کاکوروی صاحب بھی اپنے اشعار کے ذریعہ اس بات کی وضاحت کرتے ہیں ؎

نعت گوئی میں کہیں لغزش کی گنجائش نہیں
پاؤں اس وادی میں رکھنا اے سخنور دیکھ کر

ادب میں نعت گوئی کی بات کی جائے تو اس کی کئی قسمیں دیکھنے کو ملتی ہیں جیسے رسمی نعت گوئی، حقیقی نعت گوئی، عشقیہ نعت گوئی، مقصدی نعت گوئی، توصیفی نعت گوئی، تاریخی نعت گوئی قابل ذکر ہیں۔ رسمی نعت گوئی۔ جس میں قدیم شعراء اپنی منظوم شاعری کے آغاز میں روایتی انداز میں حمد و نعت کے اشعار شامل کرتے ہیں، حقیقی نعت گوئی۔ جس میں شاعر عشق رسول ﷺ میں ڈوب کر حصول ثواب و برکت کی خاطر ذکر رسول ﷺ و تعلیمات رسول ﷺ کو عام کرنے کی نیت سے صرف نعتیہ اشعار کہتا ہے) مخمورؔ کاکوروی نے جو نعتیہ کلام پیش کئے ہیں وہ عشقیہ نعت گوئی کے زمرے میں آتے ہیں۔ مخمورؔ کاکوروی کا نعتیہ کلام حب رسول میں سرشار ہو کر تخلیق کیا گیا ہے تبھی تو آپ کے اشعار میں حضور اکرم ﷺ کی تعریف و توصیف، مدح و ثنا، حیات و تعلیمات، محبت و اخوت، صداقت، غزوات اور صحابہ کی صفات جیسے موضوعات جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر نعت گوئی کے چند اشعار پیش خدمت ہیں ؎

یہ منظر وقت نے دیکھا ہے اکثر اپنی آنکھوں سے
نبیؐ نے پونچھ دی ہیں بڑھ کے خود نادار کی آنکھیں
شب معراج جاتے ہیں فراز عرش اعظم پر
ہوائیں چومتی ہیں احمد مختار کی آنکھیں

انہوں نے غزلوں کے مقابلے نعتیہ اشعار کم کہے ہیں۔ ان کا پہلا نعتیہ کلام عبدالعلیم فاروقی کی ادارت میں کاکوری سے نکلنے والا رسالہ 'البدر' میں ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ان کے نعتیہ کلام ملک کے مختلف جرائد و رسائل کی زینت بنتے رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے نعتیہ کلام میں دبستان لکھنؤ کی روایت کا خاص خیال رکھا ہے۔ یہاں کے بیشتر شعرا نے جو کلام تخلیق کئے ہیں ان میں منقبت اشعار پائے جاتے ہیں۔ مخمورؔ صاحب کے نعتیہ کلام میں صحابہ کرام کی شجاعت، حکمت اور عدل و انصاف جیسی خوبیوں کا تذکرہ بہت والہانہ انداز میں کیا گیا ہے۔ جب حضرت عمرؓ حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے تو کفار مکہ میں ایک طرح سے خوف کا ماحول طاری ہو گیا تھا۔ دائرہ اسلام میں داخل لوگوں نے سکون کی سانس لی۔ انہوں نے اسلامی حکومت کو وسعت دے کر یوروپ اور ایشیا تک پہنچا دیا، عدالت اور بیت المال کا نظام قائم کیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یکا یک لشکر باطل پہ لرزہ ہو گیا طاری
عمر کا نام سن کر کانپ اٹھیں کفار کی آنکھیں
شب ہجرت کچھ ایسی نیند تھی آقاؐ کے بستر پر
نہ سوئی تھیں کبھی یوں حیدرؓ کرار کی آنکھیں

مخمورؔ کاکوروی نے 'دیار سبز گنبد میں' ہے سرور کائنات حضور اکرم محمد مصطفیٰ ﷺ کی زندگی اور ان کی تعلیمات اور دیار مکہ و مدینہ کی روحانی فضا کا ذکر بار بار کیا ہے۔ ان کی دیرینہ خواہش ہے کہ وہ بھی دیار مدینہ کی زیارت کریں۔ اس بات کا اظہار انہوں نے ۲۰۱۷ء میں لکھنؤ کے عظیم نعت گو شاعر جناب محمد فاروق جاذبؔ لکھنوی جب حج بیت اللہ کی زیارت سے واپس آئے تو ان کے اعزاز میں ایک شعری نشست میں برجستہ ایک قطعہ کہا تھا۔ اس کے بعد وہ برابر اس طرح کے اشعار تخلیق کرتے اور دعا گو تھے یارب انہیں دیدار سبز گنبد کی توفیق عنایت فرمادے تاکہ مجھے بھی طواف کعبہ اور دیدار روضہ اقدس کی سعادت نصیب ہو۔ اس مناسبت سے چند اشعار حاضر خدمت ہیں ؎

پہنچنا چاہتے ہیں سب دیار سبز گنبد میں
بلا لے مجھ کو بھی یارب دیار سبز گنبد میں
تمنا دل میں برسوں سے ہے دیدار مدینہ کی
خدا جانے کی پہنچوں کب دیار سبز گنبد میں
نبی کا تذکرہ ہو اور قرآں کی تلاوت ہو
کھلیں جب بھی ہمارے لب دیار سبز گنبد میں

اس کے کچھ سالوں بعد آپ کو حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی اور انہوں نے ایئر لائنز ہوائی جہاز میں سفر کے دوران ایک قطعہ کہا جو آپ سب کی نذر ہے ؎

کیوں نہ قسمت پر مجھے مخمورؔ اپنی ناز ہو
سر بلندی کی طرف زینہ بہ زینہ آ گئی
روضہ سرکار کا دیدار ہوگا جلد ہی
میرے حصہ میں بھی پرواز مدینہ آ گئی

عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ شعراء و ادباء کے تخیلات و تصورات کی دنیا کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے اور وہ سماج کا بہت ہی

حساس فرد ہوتا ہے۔لیکن جب وہی شاعر عشقیہ نعت گوئی میں قدم رکھتا ہے تو مبالغہ سے کام نہ لے کر صداقت بیانی سے کام لیتا ہے اور حقیقت کی دنیا کی سیر کراتا ہے۔مخمورؔ صاحب نے اسی طرز تحریر کو اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔شعر ملاحظہ ہو ؎

مری چشم تصور نے بھی جو منظر نہ دیکھے تھے
دیار سبز گنبد میں وہ منظر دیکھ آئے ہیں

مخمورؔ کاکوروی اپنے نعتیہ کلام میں جگہ جگہ اس بات کی تمنا ظاہر کرتے ہیں کہ میں اپنی زندگی کی آخری سانس دیار سبز گنبد میں لینا چاہتا ہوں اور اگر میرا دم بھی نکلے تو دیار طیبہ میں نکلے۔وہ اپنے عشقیہ نعت کو روز حشر میں نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔یہاں پر ان کی یہ بات ہماری توجہ حسان الہند محسن کاکوروی کے لامیہ قصیدہ سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل کی طرف مبذول کراتی ہے ؎

صف محشر میں تیرے ساتھ ہو تیرا مداح
ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ یہ غزل

اسی مناسبت سے مخمورؔ کاکوروی کے چند اشعار ملاحظہ ہو ؎

تمنا دل میں ہے مخمورؔ میرے ایک مدت سے
جھکاؤں جاکے اپنا سر دیار سبز گنبد میں
وہ خوش قسمت ہیں جو جا کر نہیں لوٹے مدینے سے
پہنچ کر میں بھی جاؤں مر دیار سبز گنبد میں
آرزو یہ ہے کہ مخمورؔ مدینہ جاکر
توڑ دوں دم شہ مکی مدنی کے آگے
بروز محشر اے مخمورؔ کاش آقا یہ فرمادیں
ترے اشعار کیا حسانؓ کے اشعار کے آگے

شاعری کی مختلف صنفوں میں نعت گوئی بھی ایک صنف کی حیثیت رکھتی ہے جس میں فن اور عقیدت دونوں لازم وملزوم ہیں اگر صرف فن کی آبیاری ہو تو نعت کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے اور اگر صرف عقیدت ومحبت پر اکتفا کرلیں تو شاعری فنی خوبیوں سے دور ہوجاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ بہترین نعت گو وہ جو عقیدت ومحبت کے ساتھ فنی شعور کا بھی خیال رکھے۔مخمورؔ کاکوروی کا شمار انہیں ماہر تجربہ کار شاعروں میں ہوتا ہے جن کے یہاں جذبات کے ساتھ فن کی لطافت کا حسین امتزاج ملتا ہے ان کی نعتیہ شاعری فنی لوازمات سے آراستہ نظر آتی ہے۔ان کے اشعار کا فنی مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ وہ علم بلاغت کے ماہر اور شاعری کے اصولوں سے بخوبی واقف ہیں۔ان کے نعتیہ کلام میں زبان کی سلاست، پاکیزہ اور لطیف خیال ،اشارہ ،کنایہ ،تلمیحات وتشبیہات کا خوبصورت استعمال ملتا ہے۔مخمورؔ کاکوروی کے چند منتخب اشعار جو صرف ان کے عشق رسول ہی نہیں بلکہ ان کی فنی مہارت کی شہادت دیتے ہیں۔

جب بھی زبان کھولئے آقا کی شان میں
ہرگز مبالغہ نہ ہو شعر و بیان میں
اٹھتا تو ہوگا ذہن موذن میں یہ سوال
پیدا ہو کیسے سوز بلالی اذان میں

شاعری کا اصل جوہر یہی ہے کہ وہ عام مشاہدوں میں روحانی ،ایمانی عمق،جذباتی کشش اور فکری وسعت پیدا کردیتی ہے مخمورؔ صاحب نے اس شعر میں محض اذان کی آواز کا ذکر نہیں کیا بلکہ اس آواز کے پیچھے موجود کردار اور اس کردار کے پیچھے چھپی ایمانی کیفیت کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان صرف آواز کا امتزاج نہ تھی بلکہ عشق رسول ﷺ اور توحید کی گواہی کا عملی نمونہ تھی۔

صفا مروہ پر تھے سعی کے کیا خوشن نما منظر
ان آنکھوں سے مقام ابن آزر دیکھ آئے ہیں

یہ شعر سعی صفا ومروہ کے روحانی مناظر اور اس سے جڑی ہوئی تاریخی کیفیات کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔مخمورؔ صاحب اس عبادت کو نہ صرف اپنی زندگی کی عظیم سعادت اور خوش بختی قرار دیتے ہیں بلکہ اپنے مشاہدے کو ان آنکھوں کی معراج سے تعبیر کرتے ہیں کہ ہم نے مقام ابن آزر کا نظارہ کرلیا ہے۔

مخمورؔ کاکوروی صاحب نے دریائے نیل اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان افروز خط کے اس تاریخی واقعہ کو کس قدر فنی وعلامتی اسلوب میں بیان کردیا ہے۔دریائے نیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عظمت کردار اور صداقت ایمان کا ایسا گواہ ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ کی تحریر میں کوئی جادو نہیں تھا بلکہ اس میں اللہ پر کامل توکل، روحانی قوت اور دلوں کو بدل دینے والا ایمان تھا۔شعر ملاحظہ ہو ؎

نیل ہے عظمت تحریر عمر کا شاہد
مانتا کیوں نہ بھلا حکم یہ دریا ان کا

علاوہ ازیں تاریخ جہاد کی مناسبت سے یہ شعر پیش خدمت ہے جس کی مثال تاریخ اسلام میں بار بار دی جاتی ہے۔

عروس نو ہے گھر پر حنظلہ ہیں جنگ میں شامل
بصد شوق آ کے راہ حق میں وہ قربان بھی تو ہیں

اس شعر میں اس تاریخی واقعہ اور جذبہ ایمانی کی منظر کشی کی گئی جو تاریخ کے کسی پنے پر نہیں ملتی ہے۔ جہاد کو عروس نو پر ترجیح دینا یہ بتاتا ہے کہ دنیا کی تمام تر کشش سے درکنار ہو کر خدا اور رسول ﷺ کے لئے اپنی جان قربان کر دینا علامت ہے اس جذبہ ایمانی کا جسے تاریخ غسیل الملائکہ کے نام سے یاد کرتی ہے۔

مخمورؔ کاکوروی کے یہ چند منتخب اشعار اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ ان کا مجموعہ کلام عقیدت و محبت کی فراوانی کے ساتھ فن کا ایک کامیاب تجربہ ہے۔ ان کی شاعری میں تلمیح صرف تاریخ نہیں بلکہ پورا منظر بن جاتی ہے۔ کنایہ محض اشارہ نہیں دل کے جذبات و احساسات کا ترجمان بن جاتی ہے۔ تشبیہ صرف مماثلت نہیں پیدا کرتی بلکہ تجربہ کی تشکیل کرتی ہے۔

جن کی نظریں ہیں اٹھی تیرے گھروں کی جانب
ان کو مٹی میں ملا سکتے ہیں کنکر تیرے
لٹا دی نقد جاں شبیر نے بیعت نہ کی ہرگز
قیامت تک رہیں گی سرخرو انکار کی آنکھیں

مخمورؔ کاکوروی نے اپنے نعتیہ کلام 'دیار سبز گنبد میں' تخلیق کر کے باب نعت گوئی میں عشقیہ نعت گوئی کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے خامہ زر نگار نے مختلف رنگوں کے الفاظ کے موتے سے دیار سبز گنبد کو سجایا اور سنوارا ہے۔ لکھنؤ میں جب بھی نعت گوئی کا ذکر آئے گا تو اہل ادب کے ذریعہ مخمورؔ کاکوروی کا نام محسنؔ کاکوروی کے ساتھ بہت ہی ادب و احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔ اس سلسلے میں دبستان لکھنؤ کے شاعر ضیاؔ رحمانی سیتاپوری نے کیا خوب کہا ہے ؎

لوگ کاکوری سے واقف ہیں قریب و دور کے
تھے تقی، اطہر و انور احمدی دستور کے
شاعری میں یہاں والے کسی سے کم نہیں
اے ضیاؔ سب معترف ہیں محسنؔ و مخمورؔ کے

☆☆☆

غزل

تو ہوتا، چراغاں کا ہر سمت سماں ہوتا
سر تا بہ قدم میں بھی تیرا مری جاں ہوتا

جب تک کہ نہ ٹھوکر میں ہر وہم و گماں ہوتا
تو پرزۂ ناکارہ کی طرح بیاں ہوتا

اس بزم تعارف کا احسان ہے سب ورنہ
تم جانے کہاں ہوتے میں جانے کہاں ہوتا

گر بے ید بیضا ہے، امروز نہ فردا ہے
تیرا نہ زماں ہوتا تیرا نہ مکاں ہوتا

ہاتھوں میں ترازو ہے، آنکھوں پہ تو پٹی ہے
مظلوم سے ایسے میں انصاف کہاں ہوتا

اس اول و آخر کا میں ماننے والا ہوں
ممکن ہی کہاں تھا میں بے نام و نشاں ہوتا

تو خیر بہر صورت باشندہ دکن کا ہے
دلی میں اگر ہوتا تو اہل زباں ہوتا

☆☆☆

ڈاکٹر رؤف خیر
گولکنڈہ، حیدرآباد۔ موبائل: 9440945645

وقت وزماں: مولانا آزاد کی فکری جہات

ڈاکٹر مجاہدالاسلام
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس۔ موبائل: 9628845713

وقت وزماں کا مسئلہ انسانی فکر کی پوری تاریخ میں ایک پیچیدہ اور حیرت انگیز معمہ رہا ہے۔ کبھی یہ کائنات کی بے رحم گردش کا استعارہ بن کر سامنے آتا ہے، کبھی زندگی کے لامتناہی بہاؤ کی علامت، اور کبھی انسانی شعور کی پیداوار ایک وہم، ایک اعتباری تجربہ، یا محض ادراک کی سطح پر قائم ایک فکری تشکیل۔ افلاطون سے لے کر نیوٹن تک، اور نیوٹن سے برگساں تک، ہر بڑے مفکر نے اپنے اپنے علمی، ذہنی اور مابعدالطبیعیاتی زاویے سے وقت کو سمجھنے کی کوشش کی، مگر یہ معمہ پوری طرح کبھی وا نہ ہوسکا۔ برصغیر میں علامہ اقبال نے وقت کو روحانی اور تخلیقی معنویت عطا کی، مگر اس موضوع پر جس گہرائی، باریک بینی، نفسیاتی لطافت، تاریخی شعور اور قرآنی بصیرت کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد نے گفتگو کی ہے، اس کی مثال اردو نثر میں ناپید ہے۔ غبارِ خاطر کے خطوط میں مولانا آزاد وقت کو محض ایک فلسفیانہ یا سائنسی مسئلہ نہیں سمجھتے؛ وہ اسے انسانی تجربے، شعور، احساس، تاریخ اور الہامی حکمت کے ساتھ جوڑ کر دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک وقت جامد خانہ بندی کا نام نہیں ماضی، حال اور مستقبل کی تقسیم ان کے لیے محض تجزیاتی سہولت ہے، حقیقت نہیں۔ وقت ایک مسلسل، رواں، سیال بہاؤ ہے جہاں لمحہ وجود میں آتے ہی ماضی میں تحلیل ہوجاتا ہے، اور انسان ہر آن ایک ایسے تجربے سے گزرتا ہے جو اس کی گرفت میں آتے ہی اس کی گرفت سے نکل جاتا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں مولانا آزاد کی فکر، برگساں کے سیلانِ حیات اور اقبال کے تخلیقی وقت کے تصور سے ایک لطیف سا اشتراک رکھتی ہے، مگر دونوں سے انہیں جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ ان کا قرآنی شعور، فکری تسلط اور الہامی گہرائی ہے۔ مولانا کے نزدیک وقت صرف عقلی یا سائنسی مسئلہ نہیں بلکہ ایک کونیاتی صداقت (A cosmic truth) ہے؛ ایسا راز جس کے بغیر نہ انسان کے وجود کا فہم ممکن ہے، نہ کائنات کے نظم کی تفہیم، نہ زندگی کی معنویت، نہ انسانی ارادے اور تقدیر کا رشتہ۔ مولانا کے یہاں وقت بیک وقت خارجی کائنات کی حرکت بھی ہے اور انسانی باطن کا ارتعاش بھی؛ کائناتی گردش بھی اور داخلی کائنات کی مسلسل کشمکش بھی۔ وہ کیلنڈر، گھڑی اور ساعت کی پیمائش سے بہت آگے بڑھ کر وقت کو انسانی ادراک کی ایسی گتھی قرار دیتے ہیں جو انسان کو اس کے شعور کی حدوں سے باہر لے جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد کے یہاں وقت ایک زندہ تجربہ بن جاتا ہے کائنات کی سانس اور انسان کے باطن کی دھڑکن۔

اس مضمون میں پہلے فلسفیانہ اور سائنسی تصوراتِ وقت کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے، پھر بتدریج بحث مولانا آزاد کے منفرد اور الہامی تصورِ وقت تک پہنچتی ہے جہاں وقت ایک بہتا ہوا معما بھی ہے اور ایک مسلسل سفر بھی، اور انسان اس سفر کا ایسا مسافر جو کبھی رکتا نہیں۔ فلسفے کی تاریخ میں وقت اسی لیے مرکزی مقام رکھتا ہے کہ ہر بڑے مفکر نے اسے اپنی کائناتی تشکیل کے مرکز میں رکھا ہے۔ افلاطون نے اسے مثالیت کے مقابلے میں ثانوی امر سمجھا؛ نیوٹن نے اسے کائنات کی مشینی ساخت کے ساتھ ہم آہنگ ایک خطی بہاؤ قرار دیا؛ برگساں نے اسے انسانی شعور کے اندر بہتی ہوئی تخلیقی سیالیت بنا کر دکھایا؛ اور اقبال نے اسے ارادے، خودی اور قرآنی حکمت کی روشنی میں ایک معنوی و تخلیقی لحظہ تصور کیا۔ ان سب کے درمیان مولانا آزاد کا نقطہ نظر نہ صرف منفرد ہے بلکہ کہیں کہیں زیادہ وسیع، زیادہ انسانی اور زیادہ معنوی دکھائی دیتا ہے۔

افلاطون کا تصور یہ تھا کہ اصل حقیقت مثالیت کی دنیا میں ہے اور دنیاوی کائنات اسی مثالی حقیقت کا سایہ ہے۔ وقت اس کے لیے حقیقت نہیں بلکہ حقیقت کا عکس تھا۔ اس نظریے نے آگے چل کر فلسفیانہ مباحث کی بنیاد فراہم کی، مگر وقت کی حقیقی ماہیت کی کھوج نئے ادوار میں بدلتی رہی۔ جدید سائنسی ذہن میں نیوٹن نے وقت کو ایک سیدھی لکیر کے طور پر دیکھا سیدھی، صاف، بے پیچ وخم۔ انسانی تجربہ چونکہ لمحوں کی آمد و رفت پر قائم ہے، اس لیے یہ تصور بظاہر معقول بھی ہے۔ پروفیسر نورالحسن نقوی، نیوٹن کے اس نظری تصور کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

''نیوٹن نے زمانے کو ایک لکیر سے تشبیہ دی ہے جس کا ایک حصہ گزر چکا اور ماضی کہلاتا ہے۔ اس لکیر کا وہ حصہ جس پر ہم چل رہے ہیں اسے حال کہتے ہیں اور وہ حصہ جو آگے چل کر آنے والا ہے اسے مستقبل کا نام دیا جاتا ہے۔''

(اقبال: شاعر اور مفکر، نورالحسن نقوی،، 2000، ص126)

یہ وضاحت نیوٹن کے نظریے کی سادگی اور اس کے منطقی تسلسل، دونوں کو ظاہر کرتی ہے۔ مگر جیسے جیسے فلسفیانہ فکر نے انسانی تجربے کی پیچیدگی کو زیادہ قریب سے دیکھا، یوں محسوس ہوا کہ وقت کے اس خطی تصور میں زندگی کی اصل روانی اور کائنات کی مسلسل تغیر پذیری سمٹ نہیں پاتی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں جدید فلسفیوں خصوصاً ہنری برگساں نے خطی وقت کے مقابل ایک سیال، تغیر پذیر، داخلی و وجودی وقت کا تصور پیش کیا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس فکری انقلاب کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''مغرب میں برگساں کے فکر و نظر کو انقلابی اور مجتہدانہ خیال کیے جانے کا سبب یہ تھا کہ اس نے قدیم یونانی فلسفیوں خصوصاً افلاطون کے خیالات کے برعکس اس بات کا دعویٰ کیا کہ.... زندگی مسلسل تغیر کے سوا کچھ نہیں مادہ روح دونوں اسی حرکت و عمل کی دو مختلف صورتیں ہیں یعنی کائنات بھی محض حرکت و عمل ہے۔''

(اقبال سب کے لیے، فرمان فتح پوری، کراچی، 1979، ص300)

یہ نقطہ نظر وقت کو کائنات کے بنیادی جوہر کے طور پر سامنے لاتا ہے ایک ایسا جوہر جو ہر لمحہ بدلتا، پھیلتا اور خود کو نئے معنی دیتا رہتا ہے۔ اسی تصور کو پروفیسر نورالحسن نقوی مزید اس طرح واضح کرتے ہیں:

''برگساں زمانے کی اس تقسیم کو نہیں مانتا جسے ماضی، حال، مستقبل کا نام دیا جاتا ہے۔ نیوٹن نے زمانے کو ایک لکیر سے تشبیہ دی ہے جس کا ایک حصہ گزر چکا اور ماضی کہلاتا ہے، اس لکیر کا وہ حصہ جس پر ہم چل رہے ہیں اسے حال کہتے ہیں، اور وہ حصہ جو آگے چل کر آنے والا ہے اسے مستقبل کا نام دیا جاتا ہے۔ مفکرین نے اس نظریے کو رد کرتے ہوئے کہا کہ اس تقسیم کو مان بھی لیا جائے تو زمانے کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے: ایک وہ جو گزر چکا اور دوسرا وہ جو آنے والا ہے، کیونکہ حال نام کی کوئی چیز نہیں۔ مستقبل اس تیزی سے ماضی بن جاتا ہے کہ ہم اسے گرفت میں لے ہی نہیں سکتے۔ وقت کی تقسیم برگساں کے نزدیک اس لیے ناقابلِ قبول ہے کہ زندگی نام ہے مسلسل حرکت کا۔ وقت ایک ایسا بہاؤ ہے کہ نہ اس کی شروعات ہے نہ انجام، اور یہ بہاؤ ہر لحظہ متغیر ہے۔''

(اقبال: شاعر اور مفکر، نورالحسن نقوی، 2000، ص127)

نقوی کی اس توضیح سے یہ بات پوری قوت سے ابھرتی ہے کہ برگساں کے نزدیک ماضی، حال اور مستقبل کی ساری تقسیم محض ذہنی سہولت ہے، کوئی حقیقی وجود نہیں۔ وقت کی اصل ماہیت اس کے نزدیک ایک جاری و ساری سیلان ہے جس میں کسی ٹھہراؤ کی گنجائش نہیں۔ 'حال' کا لمحہ اتنا ناپائیدار ہے کہ پیدا ہوتے ہی ماضی میں ڈوب جاتا ہے؛ اسی لیے برگساں کے نزدیک 'حال' ایک وہم کے سوا کچھ نہیں۔ اس زاویے میں وقت انسانی شعور کے اندر سے بہنے والی ایک ایسی کیفیت ہے جو کسی بیرونی پیمائش یا کیلنڈر سے وابستہ نہیں بلکہ داخلی ارتعاش اور شعوری تجربے سے جڑی ہے۔

یہی نکتہ جدید فلسفیانہ مکالمے کا بنیادی اشکال بھی ہے کہ وقت کو جامد خانوں میں بانٹ دینا دراصل اس کی سیال اور لامتناہی فطرت کی نفی ہے۔ 'حال' ایک ایسا باریک خط ہے جو وجود میں آتے ہی تحلیل ہو جاتا ہے۔ مستقبل ایک لمحے کی نہایت باریک سرحد پر حال بنتا ہے اور اسی لمحے ماضی میں بدل جاتا ہے۔ اس لیے وقت کی اصل حقیقت ایک مسلسل، رواں اور غیر منقطع روانی ہے ایسی روانی جس میں کوئی لمحہ اپنی جگہ قائم نہیں رہتا۔ لیکن یہاں ایک بنیادی فرق واضح ہوتا ہے۔ برگساں کے نزدیک وقت کی یہ سیالیت کسی مقصد، مرکزیت یا الٰہی نظم کی تابع نہیں۔ اس کے یہاں وقت کی حرکت اپنے ہی فطری بہاؤ کی پابند ہے، نہ کہ کسی مابعد الطبیعیاتی حکمت کی۔ فرمان فتح پوری اس نکتے کو یوں بیان کرتے ہیں:

''مادہ اور روح دونوں اسی حرکت و عمل کی دو مختلف صورتیں ہیں۔۔۔۔کائنات بھی محض حرکت و عمل ہے جو کسی سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق نہیں بلکہ بے مقصد و بے منزل ہے۔عقل و وجدان بھی شعور کی دو مختلف شکلیں ہیں۔کاروباری امور میں عقل مفید ہے لیکن حقیقت تک رسائی کے لیے وجدان ضروری ہے۔عقل جامد ہونے کی وجہ سے متحرک کائنات کی محض تصویریں لے سکتی ہے، جبکہ وجدان کا تعلق استمرار یعنی زمانہ اور حرکت پیہم سے ہے، اس لیے محسوسات و تاثرات کی تصویر کشی صرف وجدان سے ممکن ہے۔''

(اقبال سب کے لیے، فرمان فتح پوری، کراچی، 1979، ص300)

یہاں برگساں کا فکری جوہر پوری طرح روشن ہو جاتا ہے، زندگی اور وجود اپنی اصل میں حرکت ہیں، اور اس حرکت کی تفہیم عقل کے ذریعے نہیں بلکہ وجدان کے ذریعے ممکن ہے۔عقل وقت کو روک کر دیکھنا چاہتی ہے، جب کہ وجدان وقت کے اندر اتر کر اس کے بہاؤ سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔اس تصور میں زندگی، وقت اور شعور ایک ہی لامتناہی حرکی حقیقت کے تین پہلو بن جاتے ہیں۔فلسفیانہ تاریخ میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ مختلف تہذیبی اور فکری ماحول میں پرورش پانے کے باوجود بڑے ذہن ایک ہی نتائج کی طرف مائل ہوئے۔اقبال اور برگساں کی فکری مماثلت بھی اسی نوع کی ہے۔دونوں نے وقت کو جامد خانوں کے بجائے زندگی کے جوہر اور شعور کی حرکت کے طور پر دیکھا۔دونوں کے زاویے مختلف سہی، مگر وقت کی سیالیت، تغیر اور داخلی تجربے نے دونوں کو ایک بنیادی ہم آہنگی میں باندھ دیا۔فرمان فتح پوری اسی ہم آہنگی کو یوں بیان کرتے ہیں:

''بڑے آدمی ایک طرح سوچتے ہیں۔علامہ اقبال حیاتِ کائنات، زمین و مکان اور فرد و ملت کے تعلق پر اسی طرح غور کر رہے تھے جس طرح برگساں کر رہا تھا۔اسی ذہنی مناسبت سے برگساں نے ایک سینیئر کی حیثیت سے اقبال کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔چنانچہ وقت کے سیلان، ذات کے امکان اور زندگی کے تغیر کے سلسلے میں اقبال کا نقطہ نظر۔۔۔۔بہت کچھ برگساں ہی سے متاثر ہے۔اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی میں اقبال نے ان موضوعات پر روشنی ڈالی ہے، اگرچہ کہیں برگساں کا ذکر نہیں کیا۔''

(ایضاً، ص304)

یہ بیان دونوں کے فکری ربط کو واضح کرتا ہے، مگر ساتھ ہی اقبال کی انفرادیت کو بھی نمایاں کرتا ہے۔اقبال نے برگساں کی سیالیت کو قبول ضرور کیا، لیکن اسے محض وجودی حرکت کے طور پر نہیں لیا۔انہوں نے اسے اپنی مذہبی، روحانی اور قرآنی بصیرت کے آئینے میں نئے معانی دیے۔اقبال کے نزدیک وقت الٰہی تدبیر اور اخلاقی ارتقا کا حصہ ہے، نہ کہ محض بے مقصد رواں بہاؤ۔فرمان فتح پوری کے ہی بقول:

''اقبال نے اپنے خیالات کو حضرت امام شافعی سے متاثر بتایا، لیکن بعض ناقدین کے نزدیک امام شافعی کا قول الوقت سیف۔۔۔۔گہرا فلسفیانہ پس منظر نہیں رکھتا۔ان کے مطابق اقبال نے دراصل برگساں کے زیرِ اثر زمان و مکان کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔۔۔۔۔برگساں کے نزدیک کائنات کی اصل حرکت ہے اور زندگی اسی حرکت کا نام ہے، جس کے پیچھے کوئی مقصد نہیں۔۔۔۔کائنات محض متحرک و متغیر ہے۔ظاہر ہے کہ زمان و مکان کا یہ لادینی تصور اقبال قبول نہیں کر سکتے تھے۔چنانچہ انہوں نے اسے رد کر کے ایسا تصورِ وقت پیش کیا جو قرآنی تعلیم سے ہم آہنگ ہے۔حضور ﷺ کی حدیث ''لاتسبوا الدہر'' زمانے کو برا نہ کہو، زمانہ خدا ہی کی تجلی ہے کی روشنی میں اقبال نے برگساں کے تصورِ دہر کو توحیدی معنویت دی۔۔۔۔اور فطرت کی حرکت کو بے غایت نہیں بلکہ ایک مخصوص مقصد سے وابستہ جانا، جس تک رسائی کے لیے انسانی روح ہمیشہ متلاشی رہی ہے۔''

(ایضاً، ص304)

اسی پس منظر میں ماہرِ اقبالیات پروفیسر جگن ناتھ آزاد اپنی کتاب 'اقبال اور مغربی مفکرین' میں لکھتے ہیں:

''برگساں کے نزدیک امتداد یا استمرار زماں
بے مقصد ہے، شروع میں اقبال اسی نظریے کے
حامی رہے لیکن بعد میں انہوں نے اپنے نظریے میں
ترمیم کی اور برگساں کے نظریے کے خلاف استمرار
زماں کو بامقصد قرار دیا، کیوں کہ اگر ارتقا کے سامنے
کوئی منزل نہیں ہے وہ ارتقا قطعاً بے معنی ہے۔

(اسلام اور مغربی مغربی مفکرین: جگن ناتھ آزاد، سن 1994، ص 122)

یوں ربط کے باوجود اقبال اور برگساں دو مختلف کائناتی زاویے سامنے لاتے ہیں: برگساں کا وقت لادینی، بے غایت اور خودرواہے؛ اقبال کا وقت الٰہی حکمت، اخلاقی ارتقا اور روحانی تکمیل کا راستہ۔ ایک میں فقط سیلان ہے، دوسرے میں تخلیقی معنویت اور منزل۔ یہی بنیادی فرق اقبال کی فکری انفرادیت کو نمایاں کرتا ہے۔ یوں فکری ربط کے باوجود، اقبال اور برگساں کے زاویے دو مختلف کائناتی نقشے بن کر سامنے آتے ہیں۔ برگساں کا وقت لادینی، بے غایت اور خودرواہے؛ اقبال کا وقت باطنی ارتقا اور الٰہی حکمت سے جڑا ہوا۔ ایک میں سمت نہیں، دوسرے میں مقصد۔ ایک میں سیلان ہے، دوسرے میں تخلیقی حرکت۔ یہی فرق اقبال کی فکری گہرائی کو نمایاں کرتا ہے۔ وقت کی ماہیت کا یہ سوال انسانی فکر کے قدیم ترین سوالات میں سے ہے۔ افلاطون اور ارسطو سے لے کر جدید وجودی، سائنسی اور ادراکی مباحث تک انسان اسی سیال حقیقت کو گرفت میں لینے کی جستجو میں رہا ہے۔ مغربی فکر کی تقسیمِ ثلاثہ ماضی، حال، مستقبل ایک سادہ حکمتِ عملی ضرور تھی، مگر یہ سوال ہمیشہ باقی رہا کہ 'حال' واقعی کوئی وجود رکھتا ہے، یا صرف شعور کی وہ بجھتی ہوئی جھلک ہے جو نمودار ہوتے ہی ماضی کے اندھیروں میں تحلیل ہو جاتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے تصورِ وقت کی انفرادیت اس میں مضمر ہے کہ وہ افلاطون، نیوٹن، برگساں اور اقبال چاروں کے بنیادی مباحث کو جذب بھی کرتے ہیں اور ان سے فکری فاصلے کا رشتہ بھی برقرار رکھتے ہیں۔ افلاطون کے برعکس وہ وقت کو مثالیت کا کوئی سایہ حقیقت نہیں گردانتے، نہ نیوٹن کی طرح اسے خطِ مستقیم کی مشینی گردش کا پابند مانتے ہیں۔ برگساں کی سیالیت، تغیر اور داخلی تجربے کے تصور سے وہ اتفاق ضرور کرتے ہیں، مگر اس کی لادینی اور خودرو ماہیت کو رد کر کے وقت کو قرآنی حکمت، الٰہی نظم اور روحانی تجربے کے تناظر میں نئی معنویت عطا کرتے ہیں۔ اقبال سے ان کی ذہنی نسبت اگرچہ وقت کی غایت، ذمہ داری اور روحانی ادراک کے باب میں نمایاں ہے، لیکن مولانا آزاد کا تصور وقت محض فرد کی تخلیقی قوت یا ارادے کا مظہر نہیں؛ ان کے نزدیک وقت انسانی شعور، تاریخ، نفسیات، یادداشت اور روحانی مشاہدے کا ایک وحدانی اور مسلسل متحرک بہاؤ ہے۔ یہی وہ امتیاز ہے جو مولانا آزاد کو دیگر معاصر مفکرین سے ممتاز کرتا ہے اور ان کے تصورِ وقت کو ہمہ جہتی انسانی اور کائناتی وسعت عطا کرتا ہے۔

اسی فکری سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ برصغیر کے بہت کم مفکر ایسے ہیں جنہوں نے وقت و زماں کے مباحث کو محض فلسفیانہ مشق سمجھنے کے بجائے تاریخی، نفسیاتی اور دینی شعور کے تناظر میں اس طرح برتا ہو کہ ایک نیا زاویہ فکر سامنے آئے۔ کلاسیکی یونانی فلسفہ، جدید مغربی مباحث اور اسلامی فکری روایت قرآن، حدیث اور مفسرین سب پر مولانا آزاد کی گہری نگاہ انہیں وقت کے تضادات کو نہایت باریک بینی سے سمجھنے کا جوہر عطا کرتی ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل کی روایتی تقسیم کو وہ منطقی اور روحانی سطحوں پر پرکھتے ہیں اور اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ یہ تقسیم حقیقت کے پورے جوہر کو سمیٹ نہیں سکتی۔ ان کے نزدیک وقت نہ جامد ہے نہ خانوں میں بٹنے والا تصور، بلکہ ایک زندہ، غیر منقطع اور لامتناہی وحدت ہے جو شعور، تاریخ اور روحانی بصیرت کو اپنے اندر جذب کیے ہوئے ہے۔ غبارِ خاطر میں مولانا آزاد نے وقت کی ماہیت پر جس گہرے شعور اور وجدانی ادراک کے ساتھ گفتگو کی ہے، وہ ان کی فکر کی ہمہ گیریت اور ذہنی وسعت کی واضح دلیل ہے۔ وہ سطحی، مقلدانہ یا محض سائنسی بحثوں پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وقت کو اس کی وجودی، نفسیاتی اور شعوری جہات کے ساتھ منکشف کرتے ہیں۔ اسی تناظر میں وہ عرب کے عظیم شاعر و مفکر ابوالعلا معری کے تصورِ وقت کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں، جو نیوٹن کی طرح وقت کی سہ جہتی خانہ بندی گزر چکا کل، موجودہ آج اور آنے والا کل کا قائل تھا۔

مولانا آزاد اس ظاہری تقسیم کے پس منظر میں چھپی فکری سادگی کو بے نقاب کرتے ہوئے سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا واقعی 'حال' نام کی کوئی ٹھوس اور مستقل حقیقت موجود بھی ہے؟ اسی لیے وہ معری نقطہ نظر پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عرب کے فلسفی ابوالعلا معری نے زمانہ کا پورا
پھیلاؤ تین دنوں کے اندر سمیٹ دیا تھا۔ کل جو گزر

چکا۔آج جو گزر رہا ہے ۔کل جو آنے والا ہے۔۔۔لیکن تین زمانوں کی تقسیم میں نقص یہ تھا کہ جسے ہم حال کہتے ہیں وہ فی الحقیقت ہے کہاں؟ یہاں وقت کا جو احساس بھی ہمیں میسر ہے وہ یا تو ماضی کی نوعیت رکھتا ہے یا مستقبل کی۔اور انہی دونوں زمانوں کا ایک اضافی تسلسل ہے جسے ہم حال کے نام سے پکارنے لگتے ہیں یہ سچ ہے کہ ماضی اور مستقبل کے علاوہ وقت کی ایک تیسری نوعیت بھی ہمارے سامنے آتی رہتی ہے اور وہ اس تیزی کے ساتھ آتی اور نکل جاتی ہے کہ ہم اسے پکڑ نہیں سکتے ہم اس کا پیچھا کرتے ہیں ،لیکن ادھر ہم نے پیچھا کرنے کا خیال کیا اور ادھر اس نے اپنی نوعیت بدل ڈالی۔اب یہ تو ہمارے سامنے ماضی ہے جو جا چکا یا مستقبل ہے جو ابھی آیا ہی نہیں لیکن خود حال کا نام و نشان دکھائی نہیں دیتا جس وقت کا ہم نے پیچھا کرنا چاہا تھا وہ حال تھا جو ہماری پکڑ میں آیا وہ ماضی ہے۔''

(غبار خاطر: مولانا ابوالکلام (مرتبہ: مالک رام 1994) ص،248)

اس اقتباس میں مولانا آزاد کی فکری گہرائی پوری وضاحت کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ 'حال' کوئی حقیقی شے نہیں، بلکہ ایک لطیف شعوری کیفیت ہے جو مستقبل سے ماضی کی طرف سفر کرتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے ظاہر ہوتی ہے اور فوراً معدوم ہو جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک وقت کی اصلی شکلیں صرف دو ہیں: 'گزر چکا' اور 'آنے والا'۔ درمیان میں جس کیفیت کو ہم حال کا نام دیتے ہیں، وہ محض ایک تسمیہ ہے، حقیقت نہیں۔یہی ادراک مولانا آزاد کو اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ انسانی زندگی ایک ایسے بہاؤ میں بسر ہوتی ہے جس میں کسی قسم کا توقف محال ہے۔یہی وہ مقام ہے جہاں کہیں نہ کہیں برگساں کی 'سیلانِ دوام' اور اقبال کے 'شعورِ زماں' کی معنوی بازگشت سنائی دیتی ہے، مگر مولانا آزاد کی استدلالی بنیادیں مکمل طور پر مشاہدہ، تجربہ اور قرآنی بصیرت سے تشکیل پاتی ہیں۔ان کے نزدیک عمر کے سال، دہائیاں یا صدیوں کی پیمائش بے معنی ہے، کیونکہ زندگی کا حقیقی جوہر اس کے داخلی بہاؤ اور 'احساسِ گزر' میں پوشیدہ ہے۔

مولانا آزاد اس احساس کو مزید واضح کرنے کے لیے ابو طالب کلیم اور ایک عرب شاعر کے اشعار نقل کرتے ہیں، جن میں انسانی زندگی کو دو دنوں کی تمثیل میں بیان کیا گیا ہے ایک دل باندھنے کا دن اور دوسرا دل کھول کر رخصت ہونے کا دن۔وہ لکھتے ہیں:

چنانچہ مولانا آزاد ابو طالب کلیم اور ایک عرب شاعر کے وہ اشعار نقل کرتے ہیں جن میں انسانی زندگی کو صرف دو دنوں کی تمثیل میں سمیٹ دیا گیا ہے ایک دل باندھنے کا دن اور دوسرا دل کھول کر رخصت ہونے کا دن۔مولانا آزاد لکھتے ہیں:

''بدنامی حیات دو روزے نبود بیش
واں ہم کلیم !با تو چگویم، چشاں گذشت
یک روز صرف بستن دل شد باین و آن
روز دیگر بکندن دل زیں آں گذشت''

(بدنامی کی یہ دو روزہ عمر کوئی وقعت نہیں رکھتی۔اے کلیم! میں کیا بیان کروں کہ میری آنکھوں پر کیا بیت گئی۔ایک دن تو دل کو کسی شئے سے باندھنے کی کشمکش میں صرف ہوا، اور دوسرا دن اسی دل کو وہاں سے چھڑانے کی تگ و دو میں گزر گیا۔)

اسی مضمون کو ایک عرب شاعر نے زیادہ ایجاز و بلاغت کے ساتھ یوں ادا کیا ہے:

''و متی یساعد الوصال ودھرنا
یومان یوم نوی و یوم صدور''

(غبار خاطر: مولانا ابوالکلام (مرتبہ: مالک رام 1994) آزاد، ص،249)

(وصال کب میسر ہو سکتا ہے جبکہ ہماری زندگی دو ہی دنوں میں سمٹ گئی ہے: ایک جدائی کے ارادے کا دن، اور دوسرا رخصت و ہجر کے آغاز کا دن۔)

مولانا آزاد ان اشعار کو محض ادبی لذت کے لیے نہیں لاتے، بلکہ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ انسانی زندگی کی حقیقت حیرت انگیز طور پر مختصر ہے اتنی مختصر کہ دعوائے درازی عمر محض وہم بن کر رہ جاتا ہے۔ مہینوں، سالوں، صدیوں کی گردش اپنی ظاہری طوالت کے باوجود انسانی شعور میں چند ساعتوں کی طرح مختصر محسوس ہوتی ہے۔ بڑے بڑے عہد، جو تاریخی پیمانے پر بہت طویل دکھائی دیتے ہیں، حقیقت میں وقت کے بہاؤ کے سامنے پل بھر کی مانند ہیں۔یہ احساس مولانا ابوالکلام آزاد کی فکری تأملات میں پوری شدت سے ابھرتا ہے کہ

وقت کی ظاہری وسعت محض ایک دھوکہ ہے؛ حقیقت اس کے پیچھے چھپی ہوئی اس لطیف، عرفانی اور شعوری ماہیت کی ہے جس تک رسائی صرف گہرے باطنی ادراک سے ممکن ہے۔ اسی تناظر میں وہ انسانی زندگی کے جوہر کو ایک نہایت شاعرانہ مگر فلسفیانہ گہرائی میں ڈھلے ہوئے اسلوب میں یوں بیان کرتے ہیں:

''اور اگر حقیقتِ حال کو اور زیادہ نزدیک ہو کر دیکھئے تو واقعہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کی پوری مدت ایک صبح و شام سے زیادہ نہیں۔ صبح آنکھیں کھلیں، دوپہر امید و بیم میں گزری، رات آئی تو پھر آنکھیں بند تھیں۔ لم یلبثوا الا عشیۃ او ضحاھا (جس روز یہ لوگ اسے دیکھ لیں گے تو انہیں یوں محسوس ہوگا کہ)دنیا میں یا حالتِ موت میں (یہ بس ایک دن کے پچھلے پہر یا اگلے پہر تک ٹھہرے ہیں۔''

(ایضاً249)

یہ اقتباس زندگی کی فنا پذیری ہی نہیں بلکہ وقت کی اصل ماہیت کو بھی بے نقاب کرتا ہے وہ ماہیت جو بظاہر طویل دکھائی دیتی ہے مگر شعور میں ایک صبح اور ایک شام میں سمٹ آتی ہے۔ مولانا آزاد کے لیے زندگی کا جوہر اسی مختصر وقفے میں اپنے معنی تلاش کرنے کا نام ہے؛ بصورتِ دیگر آخری لمحے میں حقیقت یوں منکشف ہوتی ہے کہ پوری عمر تو محض ایک لمحہ 'عشیۃ او ضحاھا' تھی۔ اسی مقام پر خلیفہ عبدالحکیم کی بصیرت افروز توضیح اس فکری ادراک میں نئی معنوی گہرائی پیدا کرتی ہے۔ وہ زمان و مکان کی اضافی حیثیت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''زمان اور مکان کوئی مستقل وجود نہیں رکھتے، وہ محض اضافی اور اعتباری ہیں۔ زمان و مکان محض زمین فرسا نظر کی پیداوار نہ ہوتے تو معراج کے تجربہ نبوی میں دونوں کی نفی نہ ہوسکتی۔ اس تجربہ میں لامتناہی دکھائی دینے والا فاصلہ اور افلاک کی بے پایاں وسعتیں آنکھ جھپکنے کے لمحہ میں کیسے طے ہوگئیں؟ جن تجربات کے لیے ایک طویل مدت درکار تھی وہ سمٹ کر ایک طرف العین میں کیسے سما گئے؟ معلوم ہوا کہ زمان و مکان مطلق نہیں بلکہ اضافی ہیں۔''

(فکرِ اقبال، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، علی گڑھ، 2002، ص232)

یہ توضیح مولانا آزاد کے تصورِ وقت کو نہ صرف مضبوط کرتی ہے بلکہ یہ حقیقت بھی واضح کرتی ہے کہ وقت کا بہاؤ کسی جامد یا یکساں رفتار رکھنے والی چیز کا نام نہیں۔ یہ شعور اور ادراک کے ساتھ بدلتا ہے، کبھی صدیوں کو چند لمحوں میں اور کبھی لمحوں کو صدیوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔

قرآنِ مجید میں بھی وقت کی اسی اضافی اور نسبتی ماہیت کی متعدد توضیحات ملتی ہیں، جن کا براہِ راست حوالہ مولانا آزاد اگرچہ نہیں دیتے، مگر ان کی تعبیرات سے ان آیات کا مفہوم پوری معنوی ہم آہنگی کے ساتھ جھلکتا محسوس ہوتا ہے:

''اور اسی عجیب کرشمے سے ہم انہیں اٹھا بٹھایا تا کہ آپس میں پوچھ گچھ کریں، ان میں سے ایک نے پوچھا 'کہو کتنی دیر اس حال میں رہے'؟ دوسروں نے کہا شاید دن بھر یا اس سے کچھ کم رہے ہونگے۔ پھر وہ بولے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم کتنا وقت رہے۔'' (سورہ کہف:19)

''یہ لوگ عذاب کے لئے جلدی مچائے ہوئے ہیں۔ اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا، مگر تیرے رب کے یہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوتا ہے۔'' (سورہ الحج:47)

''وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے اور اس تدبیر روداد اس کے حضور واپس جاتی ہے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے۔'' (السجدہ:5)

''جب ساعت برپا ہوگی تو مجرم قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں ٹھہرے ہیں، اسی طرح وہ دنیا کی زندگی میں دھوکا کھایا کرتے تھے۔'' (الروم:55)

یہ آیات اس حقیقت کو نمایاں کرتی ہیں کہ وقت کوئی مطلق، ٹھوس اور ہر حال میں یکساں رفتار رکھنے والا وجود نہیں، بلکہ شعور، سیاق، تجربے اور کائناتی نظم کے مطابق شکل بدلتا رہتا ہے۔ مولانا آزاد اسی تغیر پذیر، سیال اور ادراکی تصورِ وقت کو فکری، عرفانی اور تفسیری سطح پر اس مقام تک

لے آتے ہیں جہاں وقت ایک کائناتی نظم بھی بن جاتا ہے اور انسانی شعور کے اندر رواں ایک لطیف بہاؤ بھی۔ اس طرح ان کا تصورِ وقت نہ صرف فلسفیانہ اور دینی بصیرت کا امتزاج ہے بلکہ ایک جامع، ہمہ پہلو اور انسانی تجربے سے جڑا ہوا منفرد نظریہ بن کر سامنے آتا ہے۔

مندرجہ بالا تمام مباحث سے مولانا ابوالکلام آزاد کے تصورِ وقت کے چند بنیادی اور نہایت اہم نتائج سامنے آتے ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ کہ ان کا نظری وقت نہ کسی یونانی فلسفے کی پابندی قبول کرتا ہے، نہ کسی منطقی تجرید میں محدود ہوتا ہے، اور نہ کسی مغربی سائنسی سانچے کی میکانکی تشکیل اسے قید میں رکھ سکتی ہے۔ افلاطون کے نزدیک وقت ایک تمثیلی یا مثالی حقیقت ہے، مگر مولانا آزاد انسانی شعور اور تجربے کے بہاؤ کو نظر انداز کرنے والی اس مثالیت کو ناکافی سمجھتے ہیں۔ نیوٹن کا مطلق، خطی اور ریاضیاتی وقت بھی انہیں اس لیے ادھورا دکھائی دیتا ہے کہ وہ انسانی ادراک، روحانی جہات اور الٰہی نظام کو اپنے دائرے میں شامل نہیں کرتا۔ مولانا آزاد اس سے آگے بڑھ کر وقت کو صرف ایک جسمانی یا طبیعی انداز میں نہیں بلکہ ایک کائناتی، شعوری اور الٰہیاتی وحدت کے طور پر سمجھتے ہیں۔ برگساں کا نظریہ یقیناً مولانا آزاد سے ظاہری مماثلت رکھتا ہے، کیوں کہ دونوں وقت کو جامد تصور نہیں کرتے اور اس کی اصل ماہیت کو حرکت، تسلسل اور تغیر میں محسوس کرتے ہیں۔ مگر دونوں کے راستے اس مقام پر الگ ہو جاتے ہیں جہاں برگساں وقت کے اس بہاؤ کو غیر ہدایتی اور بے مقصد قرار دیتا ہے۔ مولانا آزاد کے نزدیک یہی نقطہ برگساں کی تنقیدی کمزوری ہے۔ وہ وقت کو اندھی حرکت نہیں سمجھتے، بلکہ اسے الٰہی نظم، اخلاقی معنویت اور کائناتی مقصدیت سے عبارت حقیقت تصور کرتے ہیں۔ اسی نقطہ پر مولانا آزاد کی فکر اسلامی توحید، قرآنی حکمت اور اقبال کی مقصدی زمانیت کے ساتھ نہایت خوب صورت ہم آہنگی اختیار کر لیتی ہے، مگر اپنی انفرادیت پھر بھی برقرار رکھتی ہے۔

مولانا آزاد وقت کو ایک ایسا لطیف مگر ہمہ گیر عنصر سمجھتے ہیں جو ایک طرف پوری کائنات کے تکوینی نظام کو منظم کرتا ہے اور دوسری طرف انسان کی اخلاقی ذمہ داریوں کو معنی عطا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک وقت کی اضافی، شعوری اور الٰہیاتی تعبیرات اصحابِ کہف کا طویل سونا، ایک دن کا ہزار برس ہونا، اور قیامت کے دن انسان کا پوری زندگی کو ایک گھڑی سمجھ لینا یہ سب اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ وقت کی اصل ماہیت کا ادراک دراصل انسان کے اپنے وجود کے فہم سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اسی لیے مولانا آزاد انسان کی پوری زندگی کو صبح و شام کے ایک مختصر وقفے سے تشبیہ دیتے ہیں؛ یہ تشبیہ محض ادبی اظہار نہیں بلکہ زندگی کی معنویت، بیداری، مقصدیت اور جوابدہی پر ان کی گہری فکری توجہ کی علامت ہے۔

یوں مولانا آزاد کا تصورِ وقت محض ایک فلسفیانہ بحث یا نظریاتی تجزیہ نہیں رہتا۔ یہ ایک تہذیبی شعور، ایک قرآنی حکمت، ایک عرفانی بصیرت اور انسانی تجربے کے گہرے مشاہدے کا ایسا نچوڑ بن کر سامنے آتا ہے جو مغربی مباحثِ وقت کی خامیوں اور ادھورے پن کو پورا کرتا ہے، انہیں نئی روحانی سمت عطا کرتا ہے، اور وقت کو ایک زندہ، بامعنی اور مقصد آفریں حقیقت کے طور پر انسانی ذہن و دل میں روشن کر دیتا ہے۔ مولانا آزاد کی فکر میں وقت صرف ایک کائناتی نظم نہیں، بلکہ انسان کے اعمال، ارادوں، امیدوں اور جواب دہی کا بنیادی پیمانہ بھی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ان کا تصور انسان کو اس کی اصل عظمت، ذمہ داری اور معنویت کا احساس بھی دلاتا ہے اور ایک ایسی فکری منزل بھی عطا کرتا ہے جو زمان و مکان کے محدود سانچوں سے بہت آگے تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس تمام فکری سفر کا حاصل یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا تصورِ وقت برصغیر کے فکری ورثے میں نہایت منفرد، جامع اور ہمہ جہت مقام رکھتا ہے۔ انہوں نے جہاں مغربی فلسفے کے تجریدی تصورات کی کمزوریوں کو بے نقاب کیا، وہاں اسلامی حکمت اور انسانی تجربے کو یکجا کر کے وقت کی ایسی تعبیر پیش کی جو نہ صرف علمی اور فلسفیانہ لحاظ سے مستحکم ہے بلکہ روحانی، اخلاقی اور تہذیبی طور پر بھی غیر معمولی گہرائی رکھتی ہے۔

مولانا آزاد وقت کو محض ایک خارجی پیمائش نہیں بلکہ انسانی وجود کی معنوی تشکیل کا حصہ تصور کرتے ہیں۔ یہی فکری بلندی ان کے نظری وقت کو آج بھی زندہ، کارآمد اور رہنمائی بخش بناتی ہے۔ یوں مولانا آزاد نہ صرف اپنے عہد کے مفکر ہیں بلکہ ہر اس دور کے رہبر بھی ہیں جو وقت کی ماہیت کو سمجھ کر زندگی کی اصل قدر اور ذمہ داری کا شعور حاصل کرنا چاہتا ہے۔

☆☆☆

ذکا ابن وحید: ایک سخنور پیارا سا

ڈاکٹر ذاکر حسین ذاکرؔ
گلشن حیدر، شانتی نگر، نزد سنت پشپا اسکول، ضلع دیوریا، اتر پردیش۔ موبائل: 9415276138

شاعر اور افسانہ نگار ذکا ابن وحید گورکھپور کی ادبی دنیا کے گم نام ادیب ہیں۔ لیکن ان کی خاموش ادبی کاوشیں کسی شناخت کی محتاج نہیں ہیں، کیوں کہ ان میں وزن ہے، وقار ہے اور انوکھی دلکشی ہے۔ 1950 کے بعد پیدا ہونے والی اہم شخصیات میں ذکا صاحب بہت بلند مقام رکھتے ہیں۔ وہ گورکھپور کے زیادہ تر ادیبوں اور شاعروں کی طرح خودستائی کے خواہاں نظر نہیں آتے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز غزل گوئی سے ہوئی۔ بہت دنوں تک غزلوں پر ان کا مشق دو یا تین اشعار سے آگے نہیں بڑھ پایا۔ مگر ابتدا میں جب کبھی وہ کوئی روایتی غزل کہتے تو اسے کسی شعری نشست میں جا کر ضرور سنا ڈالتے۔ کبھی کبھی افسانہ بھی لکھنے بیٹھ جاتے مگر وہ پورا نہیں ہو پاتا تھا۔ بہت دنوں تک ان کی ادبی زندگی کی شروعات اسی کشمکش کے دوران جاری رہی۔ ان دنوں ان کی ادبی سرگرمیوں میں کوئی تواتر اور تسلسل نہیں تھا اور اب بھی نہیں ہے۔ لیکن ان کے ذہن میں حسین لفظیات کا ابلتا ہوا لاوا تھا۔ ایک آتش سیال جیسی گرمی تھی، جو انہیں ادبی کاوشات کے لئے بے چین رکھتی تھی اور باہر آنے کے لئے مچلتی رہتی تھی۔ ذکا ابن وحید کی سب اہم خوبی یہ ہے کہ انہوں نے جتنا لکھا اس سے زیادہ پڑھا ہے۔ ان کا مطالعہ بہت عمیق ہے۔ انگریزی اردو اور ہندی ادب میں جو کچھ بھی انہیں ملا اسے پڑھ ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب بھی کچھ لکھتے ہیں اس میں ان کے مطالعہ کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ وہ لکھتے رہتے ہیں پڑھتے رہتے ہیں مگر اسی دوران کبھی ان کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ لکھنا فضول شے ہے تو یک دم سے وہ لکھنا ترک بھی کر دیتے ہیں اور مدتوں قلم کو ہاتھ نہیں لگاتے ہیں۔ پھر ایک عرصہ کے بعد ان کے قلم میں جنبش ہوتی ہے اور وہ ایک غزل کہہ دیتے ہیں یا پھر کبھی کوئی افسانہ لکھ دیتے ہیں۔

ذکا اللہ انصاری موسوم بہ ذکا ابن وحید کی ولادت گورکھپور میں 1952 میں ہوئی۔ ان کے والد وحید اللہ انصاری ملنسار اور سماجی فکر کے انسان تھے۔ ذکا صاحب کے خاندان کا آبائی پیشہ ہینڈلوم صنعت تھا۔ جس میں ان کے خاندان کے سبھی لوگ مسلسل جڑے رہتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کے والد شہر کے اہم مسائل کے تصفیے میں بھی شریک رہتے اور فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کا حصہ لیتے تھے۔ ذکا ابن وحید کی ابتدائی تعلیم مدرسہ انصاریہ امداد العلوم میں مکمل ہوئی۔ مدرسہ انصاریہ سے عربی فارسی اور اردو میں مہارت حاصل کرنے کے بعد انہیں انصار انگلش اسکول میں داخل کرایا گیا۔ انہوں نے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کی سند اسلامیہ کالج سے حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے گریجویشن کرنے کی غرض سے گورکھپور یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ابھی وہ بی اے سال اول مکمل نہیں کر پائے تھے کہ ان کے مشترکہ خاندان میں ان کی اعلیٰ تعلیم کو لے کر خلفشار پیدا ہو گیا۔ ان کے چچا اور گھر کے دیگر افراد کا خیال تھا کہ اگر ذکا یونیورسیٹی جائیں گے تو وہ لوگ بھی کام نہیں کریں گے۔ چنانچہ ذکا صاحب کو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر ہینڈلوم کے اپنے آبائی کاروبار میں ہاتھ بٹانا پڑا۔ وہ اپنے روایتی پیشہ سے جڑ تو گئے لیکن حصول علم کی ان کی خواہش کبھی ختم نہیں ہوئی۔ خالی اوقات میں وہ پڑھتے رہے۔ انہیں پریم چند کی طرح کسی دوست کے گھر میں کتابوں کا ایک ذخیرہ مل گیا تھا، جس سے انہوں نے خوب استفادہ کیا۔ انہوں نے انگریزی ادب میں جان کیٹس، جان ملٹن، ورڈزورتھ کی نیچرل شاعری کے علاوہ شیلے اور شیکسپیئر کو پڑھا۔ تھامس ہارڈی اور جارج برنارڈ شا کو پڑھا، آسکر وائلڈ اور اولیور گولڈ اسمتھ کی طویل نظموں کا مطالعہ کیا۔ ذکا ابن وحید نفیس انسان ہیں۔ ان کا لب ولہجہ بہت دلکش ہے۔ وہ نفیس اردو بولتے ہیں۔ ان کی گفتگو میں شائستگی، شرافت اور انکساری کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ ان کی گفتگو میں شیرینی ہوتی ہے اور ایسی چاشنی ہوتی ہے جو سننے والے کے کانوں میں رس گھول دیتی ہے۔ ان سب کے درمیان ان کی سب اہم خصوصیت صاف گوئی ہے۔ وہ بغیر لاگ لپیٹ کے اپنی رائے کا اظہار کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے ہم عصروں پر ایسے صاف فقرے کستے ہیں، جنہیں سن کر ذہن میں کئی سوال اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ شاید یہ ان کے احساس برتری کی انتہا ہو یا سبھی کو اپنی ذات سے ہیچ سمجھنے

کا فطری تقاضہ۔ مسلم انصاری نے اپنی کتاب دبستان گورکھپور میں ان کی انہیں کمیوں کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ذکا ان عیوب پر قابو حاصل کرلیں تو گورکھپور کے ادبی حلقوں میں ممتاز حیثیت میں نظر آئیں گے۔ مسلم انصاری کے مطابق: ''ذکا ابن وحید میں یوں تو بے شمار خوبیاں ہیں مگر کچھ ایسے عیوب بھی ہیں جو ان خوبیوں کو بے اثر کردیتے ہیں۔ مثلاً انا اور خودستائی۔ کاش وہ اپنے ان نقائص کو سمجھیں اور از خود دور کرنے کی کوشش کریں۔ اگر ایسا ہوجائے تو قوی امید ہے کہ مستقبل قریب میں وہ شہر کے ممتاز ادیبوں کی صف میں نظر آئیں گے۔''[1]

مسلم انصاری نے یہ بات آج سے پچیس سال قبل کہی تھی۔ ان دنوں ذکا کوٹ پینٹ میں کافی حسین اور پرکشش معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اب 70 سال گزر جانے کے بعد ذکا کے گال دھنس گئے ہیں اور ان کے چہرے پر سجی سنوری لمبی داڑھی ایک ٹوٹی ہوئی عمارت کے کھنڈروں کی یاد دلاتی ہے۔ اس وقت ذکا صاحب کی شخصیت میں ہوسکتا ہے کہ انا پرستی اور خودستائی کے عنصر غالب رہے ہوں مگر آج ذکا اس سے بالکل مبرا ہیں۔ آج ان کی شخصیت میں بے انتہا شرافت' نفاست اور انکساری شامل ہوگئی ہے۔

1971 میں انٹرمیڈیٹ کرنے اور 1985 میں محکمہ بیسک تعلیم میں اردو اساتذہ کے عہدے پر اپنی تعیناتی کے درمیان ذکا صاحب نے خوب پڑھا۔ لیکن اس زمانے میں جب وہ کچھ لکھنے کی کوشش کرتے تو ان کا قلم ان کے ذہنِ رسا کا ساتھ نہیں دے پاتا۔ مگر اردو ٹیچر کے عہدے پر اپنی تعیناتی کے بعد اچانک انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے جذبات پھڑک رہے ہیں اور ان کے ذہن میں لفظیات دوبارہ انگڑائیاں لینے لگیں ہیں۔ مستقل روزگار ملنے کے بعد لکھنے پڑھنے کے لئے ان کے پاس کافی وقت بھی بچا رہنے لگا۔ انہوں نے ایک بار پھر غزلیں کہنی شروع کردیں اور اس بار ان کی غزلیں ادھوری نہیں رہتی بلکہ مکمل ہوا جاتی تھیں۔ وہ اپنی غزلوں پر استاد شاعر ڈاکٹر مبارک انصاری سے اصلاح لینے لگے۔ شام کو ان کے مطب پر بیٹھ کر ادبی اور شعری مباحثے میں شرکت بھی کرنے لگے۔ اسی درمیان ایک دن ڈاکٹر مبارک انصاری نے ان کی ملاقات مسلم انصاری سے کرائی۔ مسلم انصاری ان کے لئے کوئی اجنبی نہیں تھے۔ لیکن ذکا صاحب کو ان سے کبھی ادبی نوعیت کی گفتگو کرنے کا موقعہ نہیں مل سکا تھا۔ مسلم صاحب سے ان کے والد کے گہرے مراسم تھے۔ انہوں نے ذکا صاحب سے کہا کہ اگر آپ نثر لکھیں تو کچھ نیا کر سکتے ہیں۔ اسی شام ذکا صاحب گھر آئے اور رات بھر میں ایک افسانہ لکھ کر دوسرے دن مسلم صاحب کی خدمت میں پیش کردیا۔ مسلم انصاری بھی حیران تھے۔ ایک رات میں ایک افسانہ۔ ذکا صاحب کی افسانوی تکنیک اور اس کے فطری تاثر سے مسلم صاحب بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ مسلم صاحب ذکا کے افسانوی مجموعہ ''بوند بوند زہر'' کے پیش لفظ میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''وہ ساری خصوصیات جناب ذکا ابن وحید کے افسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ جن کا ایک افسانہ متقاضی ہے اور وہ تمام ضروری عناصر مثلاً نفسیاتی تجزیہ 'معاشرتی نقائص' سیاسی تبصرے موجود ہیں جن کا اظہار نہایت بے باکی اور ہوش مندی سے کیا گیا ہے۔''[2]

ذکا صاحب کی افسانہ نگاری اور غزل گوئی کا سلسلہ بہت دنوں تک نہیں چل سکا۔ وہ بمشکل پندرہ سال میں تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ 1994 میں ان کے پندرہ افسانوں کا پہلا مجموعہ'' دوراہا ''شائع ہوکر منظر عام پر آگیا تھا اور اگلے پانچ سال یعنی 1998 میں چودہ افسانوں کا دوسرا مجموعہ'' بوند بوند زہر'' شائع ہوگیا۔ تقریباً 100 غزلوں کا ایک مجموعہ'' حرف حرف روشن'' 2003 میں شائع ہوا۔ ذکا ابن وحید کی شاعری روایت پسندی سے باہر نہیں نکل سکی اور ان کی شاعری میں وسعت اظہار کی کمی بھی کھٹکتی ہے۔ اس میں فکر اور ادراک کے لئے کوئی جگہ نہیں دکھائی دیتی ہے۔ مگر ان کے افسانوں میں معاشرتی نظام' رسم ورواج اور سماجی واقتصادی احتصال کی بہتر عکاسی ہوئی ہے۔ ان کے افسانوں کی دوسری خصوصیت وہ نثر ہے جو بے حد کشش رکھتی ہے۔ ان کے افسانوں کی نثر میں غضب کی رنگینی ہے۔ ان میں غزلوں سے زیادہ روانی اور بلاغت پائی جاتی ہے۔ ان کی نثر رجب علی بیگ سرور کی طرح پر تصنع نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ لفظوں اور جملوں میں بے انتہا سادگی اور صفائی برتی گئی ہے۔ ان کی نثر میں جدت طرازی ہے اور اظہار میں وسعت ہے۔ ان کے انداز بیان میں فہم وفراست کا دریا بہتا نظر آتا ہے' جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ذکا کے افسانوی نثر میں رنگینی اور شعریت کی جلوہ نمائی کی بات ڈاکٹر محمد اشرف بھی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ذکا صاحب بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ اس لئے ان کے افسانوں کی نثر پر کشش ہے: ''ذکا ابن وحید کا بنیادی ذہن وشعور رنگ غزل میں رچا بسا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جو بھی افسانے معرض وجود میں آئے ان میں کرداروں کے انداز

تخاطب اور مکالموں کی ادائیگی میں شاعرانہ مزاج ومنہاج جابجا محسوس کیا جاسکتا ہے' گویا ان کے افسانوی رنگ میں افسانویت کم اور شعریت کی جلوہ نمائی زیادہ نظر آتی ہے۔ذکا ابن وحید کے بعض افسانے یقیناً بہت عمدہ ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے منظر نگاری اور کردار سازی کا فنی مظاہرہ بڑے فطری انداز میں کیا ہے۔''[3]

ذکا ابن وحید کی تعلیم واجبی ہے' مگر ان کی نثر میں اتنی چاشنی اور دلفریبی ہے' جو بغیر مطالعے کے ممکن نہیں ہے۔وہ اپنے افسانوں میں جن واقعات اور لفظیات وتراکیب کا استعمال کرتے ہیں' وہ صرف واجبی تعلیم حاصل کرنے والا شخص نہیں کرسکتا۔بلکہ ایسا شخص کرسکتا ہے' جس کا مطالعہ بہت عمیق ہو۔ذکا نے اپنی معلومات کے ذخیرے کو گہرے مطالعے کے ساتھ ساتھ اپنے آس پاس وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے بھی اخذ کیا ہے۔مثال کے طور پر ان کے افسانوی مجموعہ ''دوراہا'' میں شامل ایک افسانہ ''ہاتھی کے دانت'' کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ہاتھی کے دانت خالصتاً ایک رومانی کہانی ہے۔اس کا کینوس بہت پرکشش ہے۔کہانی کی ہیروئن ششی بالا کلاس کی سب سے ذہین طالبہ ہے۔ششی بالا کلاس میں اپنی ذات میں سمٹی رہتی ہے اور کسی سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی ہے ۔کالج آتی کلاس اٹینڈ کرتی اور خالی پیریڈ لائبریری میں گزارتی یا لیبارٹری میں کسی ایکسپیرمینٹ میں اپنا مغز کھپاتی رہتی۔اس کہانی میں اس وقت نیا موڑ آتا ہے' جب کلاس میں ایک ماہ بعد داخلہ لینے والے ایک خاموش پسند طالب علم کی طرف ششی بالا کی توجہ مبذول ہوجاتی ہے۔اس طالب علم کی انفرادیت اور فکر میں ڈوبی ہوئی اس کی گہری آنکھیں ششی بالا کو اپنی طرف راغب کرتی ہیں۔افسانہ نگار نے جس عالمانہ انداز میں ششی بالا کی شخصیت کا تعارف کرایا ہے' اس سے ان کی علمی فہم وفراست کا اندازہ لگانا آسان ہوجاتا ہے۔سائنس کی طالبہ ہونے کے باوجود ششی بالا ادب اور شاعری سے گہری وابستگی رکھتی ہے۔بقول افسانہ نگار:

''انگریزی نظمیں بہت پسند کرتی خاص طور سے 'ورڈزورتھ' کی نیچرل شاعری پر تو جان چھڑکتی۔'جان ملٹن' کی المیہ شاعری بھی پسند تھی۔کبھی کبھی شیلے اور کیٹس کو بھی پڑھ لیتی۔پرانے جاسوسی ناول لکھنے والوں میں 'اسٹینلے گارڈنر' اور نئے لکھنے والوں میں 'جیمس ہیڈلی چیز' کے ناول اچھے لگتے ہیں۔

ہندی میں پریم چند اور امرتا پریتم کے ناول پسند تھے۔

ہندی فلموں سے وحشت ہوتی۔بیشتر انگریزی فلمیں دیکھتی۔وہ بھی وہ فلمیں جن میں گولڈی ہان' بوڈریک یا ارسلان اینڈرس ہوتیں۔اسے گولڈی ہان کی معصومیت بھری مسکان 'ارسلان اینڈرس کی چلنے کی ادا اور بوڈریک کی نیلی آنکھیں بہت پسند تھیں۔[4]

اس افسانے کی تھیم کوئی نیا نہیں ہے' اس تھیم کو ہندی فلموں کے علاوہ درجنوں افسانوں میں بھی بارہا دہرایا گیا ہے۔جس میں ایک امیر باپ اپنی اکلوتی بیٹی کے غریب عاشق کو نوٹوں کی گڈیاں دے کر اپنی بیٹی سے پیچھا چھڑانے کی گزارش کرتا ہے۔ذکا ابن وحید کا کلائمکس ان ہندی فلموں کے کلائمکس سے مختلف نہیں ہے۔لیکن ان کا انداز بیان اور ان کی ادائیگی کا طریقہ کافی حد تک مختلف ہے۔لڑکی کے باپ نے لڑکی کے دوست سے ملنے کے لئے اپنے گھر مدعو کیا۔لڑکی بہت خوش تھی۔وہ سمجھ رہی تھی کہ اب جلد ہی اس کے خوابوں کی تعبیر پوری ہونے والی ہے۔اقتصادی طور پر کمزور اس کا دوست ڈرتے ڈرتے اس کے گھر آتا ہے۔لڑکی کا باپ اپنی بیٹی کو اپنے دوست کے لئے چائے اور ناشتہ لانے کے لئے اندر بھیج دیتا ہے اور جب وہ حساس بشاس ناشتے کا ٹرے لے کر واپس آتی ہے تو ٹیبل پر نوٹوں کی گڈیاں بکھری ہوتی ہیں اور اس کا دوست وہاں موجود نہیں رہتا۔کہانی ختم ہوجاتی ہے۔اس کے بعد قاری کے پاس سوچنے کے لئے بہت کچھ باقی رہ جاتا ہے۔کسی بھی افسانے کی کامیابی کی دلیل یہ ہے کہ قاری کلائمکس کے بعد بھی کہانی کی تفہیم میں الجھا رہے۔

ذکا ابن وحید کا ایک افسانہ ''جھوٹا سچ'' بہت اہمیت کا حامل ہے۔یہ افسانہ ان کی کتاب دوراہا میں شامل ہے۔اسے ذکا صاحب بھی اپنے قابل ذکر افسانوں میں شمار کرتے ہیں۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ افسانہ ماہنامہ شاعر میں شائع ہوا تھا اور قارئین نے اسے بہت پسند فرمایا تھا۔افسانے کا پس منظر منڈل کمیشن کے نفاذ کے بعد طلبہ کی اس تحریک سے تعلق رکھتا ہے' جس میں درجنوں طلبہ نے مختلف شہروں میں احتجاجاً خودسوزی کرلی تھی۔انہیں دنوں گورکھپور یونیورسٹی چوراہے پر ایک طالب علم نے خودسوزی کرلی تھی۔لیکن ان دنوں عام رائے تھی کہ اس طالب علم نے خودسوزی نہیں کی تھی بلکہ اسے طلبہ کے ایک مشتعل گروہ نے پکڑ کر جبراً جلا دیا تھا۔ان دنوں اس کا ذہنی توازن

ٹھیک نہ ہونے کی بھی بات ہورہی تھی۔ذکا صاحب کا افسانہ اسی واقعہ سے متاثر ہوکر لکھا گیا معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال کسی بھی افسانے کی کامیابی کی دلیل یہ ہے کہ اسے انسان عام طور پر وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے قریب تر محسوس کرے۔جھوٹا سچ کا اہم کردار رام ہرش کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں تھا۔وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔اس کی پرورش بہت لاڈ پیار میں ہوئی تھی۔لیکن اس کی نیم دیوانگی نے اس کے والدین کے خوابوں کو شکستہ کر دیا تھا۔رام ہرش کئی کئی دن گھر سے غائب رہتا۔ہفتوں بعد وہ اچانک واپس آجاتا یا اس کی ماں کے اسرار پر اس کے والد ہری پرساد اسے تلاش کر گھر لے آتے۔محلے کے لڑکے اس کا مذاق اڑاتے۔ وہ پتھر لے کر سب کو دوڑاتا مگر کسی پر اس نے کبھی پتھر نہیں پھینکا تھا۔پوری کہانی اس کے غائب ہونے‘اس کی تلاش اور اس کے والدین کی اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے بے قراری پر مبنی ہے۔اس کہانی کا کلائمکس واضح کرتا ہے کہ رام ہرش ریزرویشن مخالف تحریک کی نذر ہوگیا۔ایک دن جب اس کے والد اس کی تلاش میں نکلتے ہیں تو ایک چائے کی دوکان میں ان کی نظر ایک اخبار کی پہلی سرخی پر ٹک جاتی ہے‘جس میں ان کے لڑکے رام ہرش کی خودسوزی کی خبر شائع ہوئی تھی۔

> ’’اور آج پھر آر کچھڑ کے ورودھ میں رام ہرش نامک ایم اے کے ایک چھاتر نے اپنی ڈگریوں سمیت آتم داہ کرلیا۔‘‘
>
> ہری پرساد کا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ اسے محسوس ہوا جیسے چکرا کر بے ہوش جائے گا۔وہ خالی الذہنی کے سے انداز میں اس تصویر کو دیکھتا رہا۔پھر دھیرے دھیرے آنکھوں میں آئے آنسوؤں نے اس تصویر کو بہت سی آڑی ترچھی لکیروں میں تبدیل کر دیا۔آہستہ آہستہ وہ آڑی ترچھی لکیریں بھی نقطے نقطے میں سمٹ کر غائب ہوتی گئیں۔آنسوؤں کی دبیز تہوں نے اس کی آنکھوں اور تصویر کے بیچ ایک دیوار حائل کر دی تھی۔‘‘[5]

ذکا ابن وحید کی کئی کہانیاں بہت اچھی ہیں۔لیکن کئی کہانیاں صرف ان کی لفظی بازیگری کا کمال پیش کر کے رہ جاتی ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جب وہ کہانیاں لکھتے ہیں تو لفظ ان کے ماتحت ہوتے ہیں اور انہیں وہ چن چن کر اپنے جملوں میں پروتے چلے جاتے ہیں۔’بھنور یادوں کا‘ ایسی ہی ایک کہانی ہے۔جس میں افسانہ نگار نے لفظیات کی بازیگری کا مظاہرہ کیا ہے۔ان کی رومانی کہانیاں بھی بہت پرکشش ہیں۔مگر اس میں جنسی تلذذ اور بوس وکنار کے واقعات نظر نہیں آتے۔لیکن قاری کو یہ احساس ضرور ہو جاتا ہے کہ معشوق کے عشق کا اظہار کتنا معنی خیز ہے۔بیڈ نمبر تیرہ‘ تجربہ اور عورت تیرے کتنے روپ وغیرہ کئی افسانوں میں رومان پسندی اپنی اخلاقی بلندی کی حدود میں نظر آتی ہے۔دوراہا اور بوند بوندز ہر میں کل تیس افسانے شامل ہیں جو سماج اور معاشرہ کے ہر مسئلے اور نقائص کی عکاسی کرتے ہیں۔فسادات‘ بے روزگاری‘ تعلیم کا مسئلہ‘ شادی بیاہ اور سماجی برائیاں‘ جہیز تشدد گویا افسانہ نگار کی نظر سے کوئی موضوع اچھا تا نہیں ہے۔جہیز تشدد پر ان کی ایک بہت اچھی کہانی ’کنواری موت‘ ہے‘ جس میں بہت صفائی اور سادگی سے جہیز تشدد کی عکاسی کی گئی ہے۔ان میں کچھ ایسی کہانیاں بھی ہیں جو واقعاتی ہیں اور جو کسی مخصوص واردات پر مبنی ہیں۔لیکن ان میں بھی دائمی حقائق کی چاشنی پائی جاتی ہے۔افسانہ نگار نے اپنے انداز بیان کے زور سے ان میں ابدی حقائق کی روح پھونک دی ہے۔

ذکا کا قلم واقعی پختہ ہے اور ان کی فکر میں ندرت ہے۔ذکا ایک دن میں ایک افسانہ لکھنے والے افسانہ نگار ہیں۔جب وہ لکھنے بیٹھتے ہیں تو تھمنے کا نام نہیں لیتے۔96 صفحے کے اس ناولٹ میں اکثر مقامات پر ہندی اور انگریزی کے ثقیل اور بے تکے لفظوں کے بے وجہ استعمال سے ان کی نثر میں کرخنگی پیدا ہوگئی ہے۔مثال کے طور پر انہوں نے ناولٹ میں سمرتھن‘ جھاڑو پونچھا‘ یاچکا‘ سنتان ‘ گھٹت گھٹناؤں‘ جٹلتائیں‘ ہسبنڈ کی ڈیتھ جیسے سیکڑوں لفظوں کا استعمال کیا ہے‘ جس سے ایک طرح کی کراہیت محسوس ہوتی ہے۔ہندی اور انگریزی کے لفظوں کا استعمال غلط نہیں ہے۔ بلکہ ہندی اور انگریزی میں بہت سارے ایسے لفظ ہیں جن کے معنی کا احاطہ اردو کے لفظ نہیں کر پاتے ہیں‘ مگر جن جملوں میں اردو کے رواں لفظیات کا استعمال بہ آسانی ہوسکتا ہے۔ان کی جگہ جٹلتائیں اور یاچکا جیسے لفظوں کا استعمال ذہن پر بہت گراں گزرتا ہے۔

یہ ناولٹ بہت پرکشش موضوع پر مبنی ہے۔ذکا صاحب نے ناولٹ کے مختصر پیش لفظ میں جن واقعات کے ہونے کی طرف اشارہ

کیا ہے۔ دراصل وہ ناولٹ کا موضوع نہیں ہے۔ہاں ناولٹ کی ہیروئن اپنے مکالموں یا گفتگو کے دوران چین اسنیچنگ' ماب لنچنگ' بے روزگاری' فرضی انکاؤنٹر بے گناہوں پر ایف آئی آر کر کے جیل میں ڈال دینے جیسے مسئلہ کا ذکر اکثر کر دیتی ہے۔ان باتوں کا ذکر کر دینا اور ان واقعات کو وقوع پذیر ہوتے ہوئے دکھانا دونوں الگ الگ باتیں ہیں۔لیکن ذکا صاحب کہتے ہیں کہ ناولٹ ہی ان موضوعات پر مبنی ہے' جو کلی طور پر صحیح نہیں ہے:''زیر نظر ناولٹ تلاش ختم ہوئی کا موضوع موجودہ حکومت کے جبر واستبداد' اکثریتی فرقے کو ہر طرح کے کام کرنے کی آزادی اور اقلیت کے اوپر ہر طرح کی پابندی' لڑکیوں کا زنا بالجبر' اقلیتی فرقے کی کچھ نامی اور مشہور ہستیوں کا انکاؤنٹر یا پھر فرضی مقدمات میں جیل' ای ڈی اور سی بی آئی کے چھاپے۔ ایک فرقے کے خلاف منتریوں کے زہریلے بیانات' ہر ایک زمین اور جائداد کو اویدھ کہہ کر توڑ پھوڑ اور جبراً قبضہ وغیرہ ہے۔''[8]

اس ناولٹ میں کہانی پن ہے اور اس کا پلاٹ بھی بہت چست ہے۔اس کی کہانی میں اخفائے راز suspence بھی ہے' جو ناولٹ کے اختتام میں ظاہر ہوتا ہے۔ دراصل یہ ناولٹ ایک کال گرل کی کہانی پر مبنی ہے' جس کے ساتھ برسوں قبل ایک شریف النفس انسان کے اوباش لڑکے نے زنا کیا تھا اور اس کے بعد اس کے والدین کا بھی قتل کرا دیا تھا۔اس کے والدین اس کے کھیتوں میں مزدوری کرتے تھے اور اس کے مویسیوں کا چارا پانی بھی کرتے تھے۔اس مزدور کنبے کی دس سالہ لڑکی کے ساتھ زنا اور ان کے قتل کا نقشہ اس لڑکی کے ذہن میں محفوظ رہ جاتی ہے۔اس کے تصوّر کے کسی گوشے میں اس لڑکے کی شبیہ بھی موجود تھی اور وہ اس سے بدلا لینے کی خواہش بھی رکھتی تھی۔مگر ناولٹ میں ایسا موقعہ کبھی نہیں آیا' جس میں کال گرل زانی کو تلاش کر کے اسے ختم کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہو ۔بلکہ وہ لڑکا جو اب ایک معروف لیڈر آر پی سنگھ بن چکا ہے' خود بہ خود کال گرل کے جال trap میں پھنس جاتا ہے۔ورنہ پتہ نہیں کب کال گرل اس تک پہنچ پاتی۔ایم ایل اے آر پی سنگھ کو ایک ایسی کال گرل کی تلاش تھی' جو اس کے دشمن کو دام محبت میں پھنسا کر قتل کر دے یا اسے راستے سے ہٹا دے۔اس کام کے لئے اس نے فیس بک سے کال گرلز کی فہرست سے میناکشی کو منتخب کیا۔اس سے قبل وہ میناکشی کو نہیں جانتا تھا۔وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس نے اپنے مزدور کی جس بیٹی کا ریپ کیا تھا' اب وہ کال گرل بن چکی ہے۔اگر آر پی سنگھ انجانے میں میناکشی کو منتخب نہیں کرتا تو میناکشی اپنے زانی تک کیسے پہنچ پاتی' اس کا ذکر ناولٹ میں نہیں ہے۔اپنے دشمن کو راستے سے ہٹانے کے لئے آر پی سنگ میناکشی کو منھ مانگی رقم دینے کے لئے تیار ہے۔ میناکشی اس کی پیش کش قبول کر لیتی ہے اور ہری پور گاؤں میں جا کر آر پی سنگھ کے دشمن گاؤں پردھان آدرش سے ملتی ہے' جو گاؤں کی زمین پر ایم ایل اے آر پی سنگھ کے ذریعے غیر قانونی طور پر قبضہ کرنے کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے میں بہت بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔

آر پی سنگھ سے سودا طے ہونے کے بعد میناکشی ہری پور گاؤں کے پردھان آدرش کو اپنے دام محبت میں گرفتار کر لیتی ہے' مگر ناولٹ میں ان دونوں کے عشقیہ داستان کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ان دونوں کے درمیان کسی طرح کے جنسی اختلاط اور عشقیہ لفظیات کی ادلا بدلی نہیں ہوتی ہے۔بس وہ آنسو بہاتے ہیں اور پھر دوبارہ ملنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ میناکشی نے آدرش کو اس کے کھیت کی جھونپڑی میں ہی بتاتی ہے کہ وہ کیسے کال گرل بنی۔لیکن وہ آر پی سنگھ کا نام پوشیدہ رکھتی ہے۔اسی دوران ایک دن آر پی سنگھ نے اسے فون کیا کہ اس کا کام اب ختم ہو گیا ہے۔ وہ اس سے مل کر اپنا حساب لے لے۔ میناکشی اس کے گھر جاتی ہے اور بہت بچکانے انداز میں بتاتی ہے کہ وہ کون ہے اور یہ کہ وہ اسے ختم کر دے گی۔وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ اس کے چاروں غنڈوں کو اس نے ہی مارا ہے۔ یہ دیکھ کر قاری جو میناکشی کو صرف ایک کال گرل سمجھ بیٹھا تھا' چکرا جاتا ہے۔قاری کو خیال آتا ہے کہ حسن کی دیوی میناکشی صرف کال گرل ہی نہیں ہے بلکہ اس کے اندر ناانصافیوں سے لڑنے کا حوصلہ بھی ہے۔آر پی سنگھ اس کے سامنے گڑگڑانے لگتا ہے اور اسی دوران وہ اپنی میز پر لگے پوشیدہ الارم بجا کر اپنے گارڈز کو مطلع کر دیتا ہے۔گارڈز کے آنے کے بعد میناکشی گولی چلا دیتی ہے' جس میں آر پی سنگھ کی موت ہو جاتی ہے۔ میناکشی گارڈز کو قابو میں کر کے فرار ہونے میں ناکام رہتی ہے اور ان کی ایک گولی سے ہلاک ہو جاتی ہے۔

پہلے دور کے مقابلے میں دوسرے دور کی ان کی تحریروں میں وہ کشش نہیں ہے' جو بیس سال قبل لکھے ان کے افسانوں کا خاصہ رہا ہے

۔تلاش ختم ہوئی کی نثر بہت بے رس اور دلکشی سے محروم ہے۔اس کی نثر میں ایک طرح کی بے مروتی اور بے رحمی کا احساس بھی ہوتا ہے۔اس سے ایک طرح کے جابرانہ رویہ کی بو آتی ہے۔پورے ناولٹ میں اس نرم خو اور حسّاس افسانہ نگار کی ناراضگی اور غصہ کا احساس حاوی رہتا ہے ۔ جب کہ ذکا کے افسانے اس رویہ سے اچھوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں نرمی اور ملائمیت ہے۔اس کے برعکس ان کے تازہ ناولٹ میں ایک ایسی خفگی اور خشکی کا احساس ہوتا ہے' جیسے ناولٹ نگار موجودہ حالات سے خار کھائے بیٹھا ہے اور اس کا ذہن غصّہ سے ابل رہا ہو۔ناولٹ کی ہیروئن میناکشی اپنے کال گرل بننے کی کہانی سناتے سناتے جب اپنی فاقہ کشی اور نوکری کی تلاش میں مردوں کی حریصانہ نظروں کا ذکر کر رہی ہوتی ہے تو ناولٹ نگار کی نثری تمازت دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔اس نے بتایا کہ جب بھی وہ کسی سے نوکری مانگنے جاتی یا کسی کے سامنے مدد کے لئے ہاتھ پھیلاتی تو سامنے والا شخص اس کے کپڑے کے اندر تک کے سارے ابھرے ہوئے خطوط اور گہرے نقوش کا جائزہ لینا ضروری سمجھتا۔ اب میناکشی کا انداز بیان ملاحظہ فرمائے جس کے بیانیہ میں بے حد کڑواہٹ بھرا ہوا ہے:

''یہ مرد بھی عجیب جانور ہے۔سوروں جیسی خصلت رکھتا ہے ۔اسے گندگی میں لوٹنے کی عادت ہوتی ہے۔گندگی چاٹتا گندگی کھاتا ہے۔گھر میں خوبصورت عورت ایک آنکھ نہیں بھاتی ہے' لیکن کالی کلوٹی لمبے ترچھے دانتوں والی پرائی عورت میں اسے حسن ہی حسن نظر آتا ہے ۔کسی مجبور' بے سہارا اور بیوہ عورت کی مدد کے لئے ان کے پاس ایک پائی بھی نہیں ہوتی ہے' لیکن جسم بیچنے والیوں کے لئے ان کے پاس قارون کا خزانہ آجاتا ہے۔''[9]

ذکا ابن وحید نے افسانہ نگاری کے ساتھ ہی غزل گوئی کی شروعات بھی کی تھی۔ذکا صاحب کے اشعار کے موضوعات میں جابجا تکرار بھی پایا جاتا ہے۔ذکا کی شاعری میں ایک ہی موضوع پر کئی اشعار مل جائے گیں۔

دوقدم کئی لوگ مرے ساتھ چلے
نہ عمر بھر کا ہوا کوئی ہم سفر مرا
اک مرے آبلہ پا کے نہ رہا ساتھ کوئی
دوقدم ساتھ مرے ہر کوئی چل کر لوٹا
چلا تھا میں بھی بڑے شوق سے مگر اے ذکا
نہ راس آئی محبت کی رہ گزار مجھے

اس موضوع پر بھی اکثر اشعار موجود ہیں۔

بالآخر پاؤں رکھنا ہے زمیں پر
ہوا کے دوش پر کب تک اڑوں میں

اسی طرح کچھ اشعار ان موضوعات پر بھی موجود ہیں۔

ادھر لیلیٰ شب نے زلفیں سمیٹیں
پرندہ ادھر اپنے پر کھولتا ہے

لیکن پہلے دور کی ان کی غزلوں کے متعلق سب سے اچھی رائے کہنہ مشق شاعر مسلم انصاری نے قائم کی تھی ۔دبستان گورکھپور میں مسلم انصاری نے زیادہ تر شاعروں کا بے رحمی سے آپریشن کیا ہے۔ اس معاملہ میں ذکا ابن وحید بے حد خوش قسمت ثابت ہوئے ہیں' جن پر مسلم انصاری نے اپنی شہرہ آفاق کتاب 'دبستان گورکھپور' میں دو صفحہ خرچ کیا ہے۔مسلم انصاری ان کی غزل گوئی کے متعلق فرماتے ہیں:

''ذکا ابن وحید نہ صرف ایک مایۂ ناز افسانہ نگار ہیں بلکہ اردو کے مشہور' مقبول' خوش گو اور قادرالکلام غزل گو شاعر بھی ہیں۔ان کے کلام میں حسن وعشق کے معاملات کم' حالاتِ وقت کی عکاسی بھرپور پائی جاتی ہے۔وہ اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی پر عبور رکھتے ہیں۔''[10]

یہاں 'حرف حرف روشن' اور اور 'سب رنگ' میں شامل ان کی غزلوں سے ایک انتخاب پیش کرنا مناسب ہوگا تاکہ قارئین خود بخود ذکا ابن وحید کی غزل گوئی کے معیار و مرتبہ کا تعین کر سکیں۔

ڈھلتے اگتے ہوئے سورج ہوا بوڑھا پھر بھی
تم ہی لوٹے نہ مرا روٹھا مقدر لوٹا

اگر زمین پہ گرتے تو قدر کھودیتے
پلک پہ اشکوں کا رکنا بہت ضروری تھا
بالآخر پاؤں رکھنا ہے زمیں پر
ہوا کے دوش پر کب تک اڑوں میں
بھوک کیا چیز ہے روٹی کی حقیقت کیا ہے
ہوگا احساس کہ جب خود پہ میاں گزرے گی
کرشمہ جانے کیسا ہو گیا ہے
جو قاتل تھا مسیحا ہو گیا ہے
بڑھایا جھوٹ کو جھوٹوں نے اتنا
کہ جو سچ تھا فسانہ ہو گیا ہے
ظلم وانصاف پہ جو فرق نہیں کرسکتی
اس قدر اندھی عدالت نہیں دیکھی جاتی
اس طرح تم ہو ضرورت میری
زندہ رہنے کو ہوا ہو جیسے
ترے بدن کا کہیں عکس تو نہیں اے دوست
وہ اک اُجالا جو نورِ سحر میں رہتا ہے
جو خود میں رکھتا تھا اک آفتاب کی وسعت
سمٹ کے آج وہ ذرّہ دکھائی دیتا ہے
پیار کے عنوان سے میں نے جو لکھا تھا کبھی
آنسوؤں میں بہہ گیا اب وہ فسانہ ہے کہاں

حوالے:

1۔دبستان گورکھپور از مسلم انصاری، فیضی آرٹ پریس گورکھپور 1997، ص:614
2۔بوند بوندز ہر از ذکا ابن وحید، فیضی آرٹ پریس گورکھپور 1998، ص: پیش لفظ
3۔سب رنگ از ذکا ابن وحید، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 2025، ص:17
4۔دوراہا از ذکا ابن وحید، فیضی آرٹ پریس گورکھپور 1994، ص:69
5۔دوراہا، ص:83
6۔سب رنگ، ص:23
7۔تلاش ختم ہوئی از ذکا ابن وحید، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی 2025، آخری ٹائٹل کور
8۔تلاش ختم ہوئی، حرف آغاز
9۔تلاش ختم ہوئی، ص:89
10۔بوند بوندز ہر، پیش لفظ

☆☆☆

غزل

تم ہزارو ہوا کی صورت میں
اور اک میں دیا کی صورت میں

کچھ جو پایا قریب شہ رگ کے
تجھ کو پایا خدا کی صورت میں

مجھ کو جب چاہے جس طرح چاہے
مانگتا ہے دعا کی صورت میں

تیری یادوں کو میں دسمبر میں
اوڑھتا ہوں ردا کی صورت میں

اپنے بیمار کو محبت سے
زہر دے دے دوا کی صورت میں

اب کے انساں میں کم سے کم صاحب
چاہئے کچھ وفا کی صورت میں

مجھ کو دنیا عطا ہوئی مصداقؔ
جانتا ہوں سزا کی صورت میں

☆☆☆

مصداق اعظمی
اعظم گڑھ، یوپی۔موبائل:9451431700

نسیم زاہد: شخص اور شاعر

ڈاکٹر عامر قدوائی

کویت سٹی، کویت۔ موبائل: +96566278931

نسیم زاہد کویت میں ہوا کے ایک دلنواز جھونکے کی طرح ظاہر ہوئے ہیں بہت سادہ اور منکسر مزاج انسان ہیں۔ بہت مخلص اور با اخلاق شخصیت ہیں۔ کیونکہ عالم دین ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں دین کی تبلیغ بھی ہوتی رہتی ہے۔ یہ کوئی عیب نہیں ہے بلکہ انسانی رجحان کی بات ہے۔ چند اشعار مثال کے طور پر پیش خدمت ہیں:

کہتا ہے آسماں و زمین کا حسین نظام — اس کائنات کا کوئی خالق ضرور ہے
واقعی کائنات کی ہر شے — اک حقیقت کی بے حجابی ہے
پیام آسماں سے نہیں ہے کوئی نسبت ہے — ہے ناداں بس تلاوت پر تلاوت کر رہا ہے
یہ سورج اک خدا ہونے کے پیارے فلسفے کی — حقیقت میں بہت اچھی وضاحت کر رہا ہے
خواہش ہے جس سکوں کی پایا نہ جائے گا — جب تک خدا کو دل میں بسایا نہ جائے گا
خاص واعظ ہیں پھر بھی دونوں میں — مدتوں سے دعا سلام نہیں

نسیم زاہد جب سے کویت آئے اور لوگوں کی ان سے قربت بڑھی اور تبادلہ خیالات کا سلسلہ شروع ہوا، میں نے بطور خاص مشاہدہ کیا اور پایا کی بہت سے فنکار جن کے ہاں ناموزونیت کھٹکتی تھی اب کافی حد تک ان کی طبیعت موزوں ہوگئی ہے۔ یہ ایک ایسا سچ ہے جس نے بے انتہا مسرت سے نوازا ہے۔ شاعری ایک ایسا فن ہے جو خداداد ہوتا ہے اور پیدائش کے ساتھ آتا ہے۔ ہر انسان شاعر نہیں بن سکتا صرف مصرع موزوں کر لینا ہے شاعری نہیں ہے۔

شاعری میں مضمون، اشارے، کنائے، تشبیہ، استعارے، الفاظ کی نشست و برخاست اور اس کے علاوہ بھی بہت سے نکتے ہیں۔ جیسے کسی دلہن کو خوبصورت لباس، زیورات اور دوسری بہت سی دلکش و دل دلآویز چیزوں سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اشعار کو بھی خوبصورت الفاظ اور شعری لوازمات سے آراستہ کیا جاتا ہے اور اس ہنر میں نسیم زاہد بہت سلیقہ مند ثابت ہوئے ہیں ڈاکٹر بشیر بدر نسیم زاہد کے پسندیدہ شاعر ہیں اور نسیم نے بڑی توجہ سے ان کی شاعری کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ جب کسی شاعر کا مجموعہ کلام یا کسی ناول نگار کا ناول دونوں ہی تخلیقات کا مطالعہ جب کوئی شخص بہت دلچسپی اور غور و خوض کے ساتھ انجام دیتا ہے تو وہ تحریریں اس کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتی ہیں اور کسی گوشے میں اپنی جگہ بنا لیتی ہیں اور کہیں لاشعور میں ہو جاتی ہیں اور جب فنکار اپنی تخلیق کے عمل سے گزرتا ہے تو ان تحریروں کی جھلک لاشعور سے نکل کر سامنے آتی ہے، کبھی گہری اور کبھی خفیف ہوتی ہیں۔ نسیم زاہد کی تخلیقات کے ساتھ بھی ایسا ہوا ہے لیکن یہ جھلک بہت خفیف سی ہے۔ اپنی دلیل میں کچھ اشعار پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

فاختہ نے سر پہ آنچل لے لیا — دھوپ بالکل پانی پانی ہو گئی
عدل مقتول کی طرح نہ لگے — قاتلوں کو اگر سزا مل جائے
بے وفائی پھسل کے چیخ اٹھی — پیار کی سیڑھیاں اترتے ہوئے
زباں کھولی تو لہجے سے یہ ہوا معلوم — وہ دوپہر کی تپش بھلا نہیں کرتی

نسیم زاہد ماہر عروض بھی ہیں اور عروضیوں کے بارے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ عروضوداں کبھی اچھا شاعر نہیں ہو سکتا لیکن ان کا مجموعہ کلام ''چراغ روشن ہے'' پڑھنے کے بعد یہ بات ثابت ہو جاتی ہے یہ کہاوت نسیم زاہد پر چسپاں نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر یہ اشعار پیش خدمت ہیں:

آئی وہ رفتہ رفتہ تقدس کی راہ تک
پھر یوں ہوا کی نیت ناسے بگڑ گئی
ماں کے خلوص جیسا تھا موسم بہار کا
فصل خزاں ہے سر پھری اولاد کی طرح
جب خون کیا اس نے تمناؤں کا میری
سناٹوں نے جیون میں بڑی دھوپ مچائی
ہوس چاہے تو مجھ کو آزما لے
میں یوسف ہوں زلیخا سامنے ہے
ماہ وخورشید سے نہ دو تشبیہ
آپ اپنا جواب ہیں ہم لوگ
دنیائے بے ضمیر کی تاریخ ہے گواہ
موقع ملا تو بک گئے عالی مقام لوگ

نسیم زاہد نے جدت کو سینے سے لگایا لیکن روایت کو وہ کبھی فراموش نہیں کر سکے اور انہیں دونوں کی آمیزش نے ان کی شاعری کو دو آتشہ کر دیا ہے۔ نسیم کے کچھ اشعار حدیث حسن کے زمرے میں آتے ہیں۔ آیئے ان سے بھی لطف اندوز ہوں۔

بجلیاں اجلے محل میں کر رہی ہیں مشورہ
چاہتی ہیں پھر کسی گلزار کو صحرا کریں
ٹوٹ جائے نہ کہیں ہجر مسلسل کے سبب
آئینہ روتا ہے بس ذکر تمہارا کر کے
گھر سے سجا کے خواب وہ آیا تھا شہر میں
پورا ہوا جو خواب تو گھر خواب ہو گیا
خدا کرے کہ زمین پہ کہیں نظر آئیں
تصورات میں جو بستیاں بساتا ہو
نہ اخلاص دل میں نہ آنکھوں میں آنسو
یقیناً یہ توبہ کی بے حرمتی ہے

ہر شاعر ہر فنکار اپنے عہد کا نمائندہ ہوتا ہے۔ نسیم زاہد بھی اسی عہد کے نمائندہ ہیں۔ جو کچھ نظر کے سامنے ہوتا ہے یا پردے کے پیچھے ہوتا ہے نسیم صاحب کی فنکارانہ نظر سے چھپ نہیں پاتا۔ چاہے وہ کوئی واقعہ ہو، کوئی حادثہ ہو یا اور کوئی بات۔ شاعر اسے تنقید کی گہری نظر سے پرکھتا ہے اور الفاظ کا خوبصورت جامہ پہنا کر عوام کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں یہ شعر

یہ بے وقار سیاست کا ایک حصہ ہے
سروں کی فصل اُگائی گئی ہے جلسے میں

آج کل سیاستداں اپنی مقبولیت اور طاقت کو ظاہر کرنے کے لیے لوگوں کی بھیڑ اکٹھا کرتے ہیں اور اس کے لیے لوگوں کو کرائے پر بلایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اب عوام بیدار ہو چکے ہیں اور بنا پیسے کے کوئی بھی بھیڑ کا حصہ نہیں بنتا۔ اسی لیے شاعر نے اسے بے وقار سیاست کا نام دیا ہے ایک اور شعر دیکھیے

یہ حال ہے تو چلیں چاہے جو سزا دے دیں
حضور کچھ نہیں کہنا مجھے صفائی میں

عدالت پہلے ایک ایسا شعبہ تھا جہاں انصاف ملنے کی امید ہوتی تھی لیکن اب امید بری طرح سے ٹوٹ پھوٹ کر مایوسی کا شکار ہو چکی ہے۔ اس لیے کہ قانون زور آور کے ہاتھوں بک چکا ہے۔ رشوت، دھاندلی بازی، حاکم وقت کی زبردستی۔ یہ وہ ہتھیار ہیں جن سے انصاف کا خون کیا جاتا ہے۔ نسیم صاحب کا یہ شعر اور ان کا عزم دیکھیے

مر جائیں گے اچھال کے خالی گلاس ہم
ذلت اٹھا کے یوں نہ بجھائیں گے پیاس ہم

اپنی خودداری کا پاس رکھتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ مر جانا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ کوئی ہماری مدد کرے اور تصویر کھینچ کر بار بار ہمیں ذلیل وخوار کرے۔ اس شعر میں جو تیور ہے، جو لہجہ ہے، جو کرب ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ عوام کو بیدار کرتے ہوئے سیاست کی بے راہ روی سے متعلق یہ شعر

تمام عمر یہ تاریکیاں ستائیں گی
اگر کوئی نیا سورج اُگا نہیں سکتے

سیاسی حالات سے گھبرا کر نسیم زاہد کہتے ہیں کہ نیا انقلاب برپا کرو۔ یہ موجودہ نظام اکھاڑ پھینکو اور نئے معتبر چہرے، نئے سورج اُگاؤ ورنہ ہمیشہ تاریکیاں ہمیں ڈراتی رہیں گی۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے اشعار ہیں جو مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں اور جن کی لفظیات، جن کا لہجہ بتاتا ہے کہ یہ نظم زاہد کے قلم سے وجود میں آئے ہیں۔

نسیم زاہد کا پہلا شعری مجموعہ ''چراغ روشن ہے'' یعنی دعوت عام ہے جو چاہے فیضیاب ہو۔ علم کا دریا بہہ رہا ہے غوطے لگائیں، موتی چنے اور اپنی جیبیں بھرتے رہیں۔ میری دعا ہے کہ آغاز سفر ہی سے انہیں شاباشی ملے اور ہر خاص و عام میں ان کا کلام قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ جس کی کہ ہر حال میں نسیم مستحق ہیں۔

☆☆☆

میں تنہائیوں کی گفتگو ہوں: ڈاکٹر ایم۔ نسیم اعظمی

اشتیاق سعید

فلیٹ B-01، نیو پیراڈیس، گیتا نگر، فیز-II، میرا روڈ، تھانے، مہاراشٹر۔ موبائل: 9930211461

ادب میں کچھ لوگ کنویں کی مانند ہوتے ہیں، کنواں جو ایک ہی جگہ پر ساکت و جامد ہوتا ہے۔ اس کے بطون میں ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا سوتا اُبلتا رہتا ہے، اس لحاظ سے کنواں تشنہ لبوں کی تشنگی بجھاتا ضرور ہے، بشرط یہ کہ تشنہ لب کنویں کے پاس جائیں۔ کچھ لوگ گدلے پانی کے جوہڑ کی طرح ہوتے ہیں، جو چوپایوں یا آوارہ جانوروں کی پیاس بجھانے کے کام آتے ہیں۔ چند ایک لوگ ٹھہرے پانی کی جھیل کے مثل ہوتے ہیں جو کبھی دریا بننے کی کوشش ہی نہیں کرتے برخلاف اس کے کچھ لوگ دریا تو ہوتے ہیں لیکن آہستہ روی کے باعث زیادہ دور تک نہیں جا پاتے اور سوکھ جاتے ہیں۔ سمندر کی سی وسعت، گہرائی و گیرائی، سُکوت اور ظرف کم ہی لوگوں کا مقدّر ہوتا ہے۔ یہ تمام خصوصیات جن کے وجود کا حصّہ بن جاتی ہیں، وہ ادباء و شعراء نابغۂ روزگار کہلاتے ہیں۔ کون ایسا شاعر یا ادیب ہوگا جسے شہرت کی بلندی راس نہ آتی ہو، یا وہ نام و نمود کی فضاؤں میں پرواز کرنا نہ چاہتا ہو۔ کتنوں کی تو پروازیں اونچی اُڑانوں میں کھو گئیں۔ پھر اُن کا پتہ نہ چلا کہ وہ کس جہان کے ہوئے؟ میں نے تو چند ایسے افراد بھی دیکھے ہیں جن کے پاس پر ہے نہ طاقتِ پرواز، مگر وہ خیالی اُڑانیں ضرور بھرتے ہیں۔ نہ صرف اُڑانیں بلکہ اپنی خیالی اُڑانوں سے دوسروں کو مرعوب بھی کرتے ہیں۔ اسی قبیل کے میرے ایک دوست محمد عرفان جونپوری ہیں۔ آپ شاعر ہیں نہ ادیب مگر شاعروں اور ادیبوں سے دوستی گانٹھنا ان کے مشغلے میں شامل ہے۔ یوں تو ان کا آبائی پیشہ کتابوں کی جلد سازی ہے۔ چنانچہ کتابوں کو بناتے سنوارتے کب انہیں کتابوں سے عشق ہو گیا انہیں بھی نہیں پتہ، آج ان کے پاس کتابوں کا خاصہ ذخیرہ موجود ہے، اور اس ذخیرے میں دن بہ دن مزید کتابوں کا اِضافہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ آپ جب بھی دہلی، ممبئی یا لکھنؤ جاتے ہیں تو اپنی قلیل آمدنی کے باوجود ہزار دو ہزار روپئوں کی کتابیں ضرور خرید لاتے ہیں، اور اپنے شاعر اور ادیب دوستوں کو بڑے چاؤ سے دکھاتے ہیں۔ ان کا یہ وتیرہ انہیں ادب نوازی کی معراج عطا کرتا ہے۔ میرے نزدیک ادب نوازی کی کئی منزلیں ہیں۔ اب وہ کس منزل پر فائز ہیں، میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا، البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ بیرون جونپور یا ملک کی مختلف ریاستوں سے جونپور آنے والے شعراء و ادباء کے استقبال میں پیش قدمی ان کی سرشت میں شامل ہے، نیز نو واردانِ شیرازِ ہند کے شایانِ شان اپنے دولت کدے پر ضیافت کا اہتمام ان کے ادب نوازی کا بیّن ثبوت ہے۔

کہتے ہیں انسان زندگی میں کئی عشق کرتا ہے، لیکن پہلا عشق بھلائے نہیں بھلتا۔ اسی طرح میں نے بھی عرفان جونپوری کی مہمان نوازی یا میزبانی کا لُطف دسیوں مرتبہ اُٹھایا ہے، مگر پہلی مرتبہ کا جنونی خلوص، افلاطونی محبت اور شعوری وضع داری اب تک میرے وجدان میں نقش ہے۔ مجھے یاد ہے، دیوگاؤں سے آتے ہوئے میں نے انہیں اپنے جونپور پہنچنے کی اطلاع دے دی تھی۔ میری بس جب جونپور کے 'سپاہ' بس اڈّے پر رُکی تو اچانک میری نگاہ عرفان صاحب پہ جا ٹکی، جو بس کے نکاسی پر شُتر مرغ کی مانند گردن اُٹھا اُٹھا کے دیکھ رہے تھے۔ میں جوں ہی بس سے باہر آیا اُنہوں نے لپک کر مجھے اپنی بانہوں کے حِصار میں کس لیا اور میرا بیگ لے کر ایک سائیکل رِکشا کی طرف بڑھے۔ ''امے، بڑی مسجد چلیہو''۔

رِکشا پولر جھٹ بریک پر کسے ہوئے تار کو ڈھیلا کرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھو صاحیب''۔ ہم دونوں لپک کر رِکشے پر سوار ہو گئے اور رِکشا ٹن ٹن گھنٹی بجاتا ہوا چل پڑا۔ گلی در گلی دائیں بائیں ہوتے ہوئے ایک فصیل بند مکان کے سامنے ٹھہر گیا۔ عرفان صاحب انتہائی سُرعت کے ساتھ رِکشے سے اُتر پڑے اور اسی سُرعت کے ساتھ جیب سے مُڑے تُڑے دس دس کے تین نوٹ برآمد کیے اور رِکشا بان کے حوالے کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ''امے ٹھیک ہے نا؟''۔

رکشا بان کوئی تاثر دیے بغیر آگے بڑھ گیا اور ہم بے پھاٹک کے فصیل میں داخل ہوگئے۔ دور و یہ مکانات سے ہوتے ہوئے وہ مجھے آخر کے مکان میں لے آئے اور ایک کمرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ تشریف رکھیں، ہم ابھی حاضر ہوتے ہیں''۔ اور خود بغل کے کمرے میں گم ہوگئے۔

مجھے جس کمرے میں بیٹھنے کا کہا تھا اُس میں پہلے ہی سے بھاری تن وتوش کے ایک صاحب صوفہ نما کرسی پر پسرے اونگھ رہے تھے۔ ان کی خوش لباسی اور چہرے پر مترشح فہم و فراست سے کسی ذی وقار شخصیت کا گمان ہوتا تھا۔ میں اس خوف سے کہ کہیں موصوف کی نیند میں خلل نہ پڑ جائے جوتے اُتارنے میں توقف کیا۔ اس دوران عرفان صاحب ایک ہاتھ میں پانی سے بھرا شیشے کا جگ اور دوسرے میں ایک ٹرے جس پر تین شیشے کے گلاس اوندھے رکھے ہوئے تھے، بغل کے کمرے سے وارد ہوئے اور با آواز بلند کہا۔ ''ارے بھائی آیئے، تکلّف نہ کیجئے''۔ عرفان صاحب کی آواز پر اونگھ رہے شخص نے آنکھیں کھول دیں اور ہمیں دیکھ کر جھٹ اُٹھ کھڑے ہوئے اور لپک کر مجھ سے مصافحہ کیا اور انتہائی ادب واحترام کے ساتھ مجھے اُس کرسی پر بیٹھایا جس پر خود براجمان تھے۔ اس اثنا میں نمکین اور بسکٹوں کی پلیٹیں آگئیں، چند ثانیہ بعد عرفان صاحب ٹرے میں چائے کی چار پیالیاں لیے آئے اور اسے میز پر قرینے سے رکھتے ہوئے گویا ہوئے۔

''اسلم سہیل صاحب کو بلوایا ہے، دیکھئے آتے بھی ہیں یا نہیں؟''۔

میں کچھ کہنا چاہ ہی رہا تھا کہ اجنبی شخص کی اونگھتی آواز کمرے میں لہرائی۔ ''کہیں گئے نہ ہوں گے تو ضرور آئیں گے''۔

''ہاں بھائی! یوں بھی یہ وقت اُن کے آرام کا ہوتا ہے''۔ میری جانب چائے کی پیالی بڑھاتے ہوئے عرفان صاحب گویا ہوئے۔

''عرفان بھائی، آخر یہ اسلم سہیل صاحب ہیں کون؟''۔ میں نے استعجابیہ لہجے میں عرفان صاحب سے استفسار کیا۔

عرفان صاحب چونکہ مُنہ میں ایک مٹھی نمکین بھر چُکے تھے، اس لیے بولنا چاہتے ہوئے بھی بول نہ سکے، جبکہ اجنبی شخص بسکٹ کا ٹکڑا مُنہ میں چبھلاتے ہوئے گویا ہوئے۔

''اُستاد شاعر ہیں بھئی، یوں سمجھئے کہ فی الوقت جونپور کی ناک ہیں''۔

''جی، یہ تو ہیں ہی، اہم بات یہ ہے کہ آپ علامہ اقبال سہیل کے آخری شاگرد ہیں''۔ عرفان صاحب نے یہ جملہ آنکھیں نچاتے ہوئے کچھ اس انداز سے کہا گویا وہ کوئی دور کی کوڑی لے آئے ہوں۔

''لیکن بھائی معاف کرنا میں نے حضرت کا نام کہیں پڑھا نہ سُنا''۔

''کیا بات کرتے ہیں، اُن کی دو غزلیں 'ادبی گزٹ' کے تازہ شمارہ میں موجود ہیں''۔ اجنبی شخص کی آواز غرّائی۔

''بھائی میں نے 'ادبی گزٹ' دیکھا نہیں ہے، البتہ نام ضرور سُنا ہے، کوئی سات آٹھ ماہ قبل مجھے 'ادبی گزٹ' کے مدیر ڈاکٹر ایم۔ نسیم اعظمی کا ایک خط موصول ہوا تھا، انھوں نے مجھ سے افسانہ بھجوانے کی درخواست کی تھی''۔

میری اس بات پر عرفان صاحب کا چہرہ فق ہوگیا اور وہ حیرت سے میرا چہرہ نہارنے لگے، جبکہ اجنبی شخص نشست پر پہلو بدلنے لگے تھے۔ میں ان کے اس رویے سے بے پرواچائے کی چُسکی لیتے ہوئے بولا۔

''ڈاکٹر ایم۔ نسیم اعظمی 'ادبی گزٹ' مئو کے کسی محلے سے نکالتے ہیں۔ وقت نکالیے، چلیے کسی دن مِل آتے ہیں، بھئی پروانچل میں ادب کا چراغ روشن کیے ہوئے ہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی تو ہونی ہی چاہئے''۔

''اشتیاق بھائی، اگر ڈاکٹر نسیم صاحب کو یہیں بُلوا لیا جائے تو کیسا رہے گا؟'' عرفان صاحب اپنی آنکھوں سے پھوٹنے والی تبسّم کی کرنوں کو ہونٹوں پہ سمیٹتے ہوئے بولے تھے۔

''عرفان بھائی ممکن ہے آپ اپنے رُسوخ یا ذاتی تعلقات کی بنا پر انہیں یہاں بلوا لیں۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ کسی مدیر کے شایانِ شان نہیں۔۔ اُن کے درِ دولت پر ہماری حاضری اُنہیں یک گونہ مسرّت بخشے گی، اور۔۔۔۔۔'' میرا جملہ ابھی تمام ہوا بھی نہ تھا کہ اجنبی شخص قطع کلامی کرتے ہوئے بولے۔

''اشتیاق صاحب، خاکسار ہی ایم۔ نسیم اعظمی ہے''۔

''کیا!'' فرطِ حیرت سے میرا مُنہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''جی ہاں! قصور میرا ہی ہے جو میں نے خود کو آپ سے متعارف نہیں کروایا، حالانکہ یہ کام عرفان صاحب کا تھا، خیر!''۔

''اچھا ہی ہوا نسیم صاحب، اجنبیت کا باندھ کچھ دیر سے ٹوٹا، میں خود کو حیرت انگیز مسرّت و انبساط کے سیلاب میں بہتا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ نسیم صاحب نے میرے کہے کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

''میرے ارسال کردہ اُس خط کی رسید آج آپ کی زبانی ملی

ہے۔اس بات کی مجھے خوشی ہے اور ملال بھی!''۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے، خوشی اور ملال دونوں ایک ساتھ؟''۔

عرفان صاحب چیں بہ جبیں ہوئے۔

''خوشی اس لیے کہ میری کاوش اکارت نہیں گئی اور ملال اس بات پر کہ اشتیاق صاحب نے میرے خط کو قابلِ اعتنا نہیں جانا''۔

سچ ہے کہ میں نے اس خط کو خاص اہمیت نہیں دی تھی، کیونکہ اس قبیل کے خطوط آتے ہی رہتے ہیں، مدیر بننے کی للک میں دو ایک لوگ مِل کر رسالہ جاری کرنے کی ٹھان لیتے ہیں اور جوشِ جنوں میں لائحہ عمل بھی ترتیب دے دیا جاتا ہے، تخلیقات کے لیے لکھاریوں کو خطوط بھی لکھ دیے جاتے ہیں، حتیٰ کہ اطمینان بخش مواد اکٹھا بھی ہوجاتے ہیں، لیکن جب سرمایہ لگانے کی بات آتی ہے تو سارا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ غالباً یہی سبب تھا جب میں نے ایم نسیم اعظمی کے خط پر مئوناتھ بھنجن کا پتا دیکھا تو یکلخت میرے ذہن میں کھٹر پٹر پاؤر لوموں کا شور اُٹھنے لگا اور اسی شور کے درمیان ایکہرے بدن کا ایک شخص جس کی ٹھوڑی پر مٹھی بھر خشخشی ڈاڑھی، سر پہ دوپلی ٹوپی، لنگی گنجی پہنے کمرے کے ایک گوشے میں کاغذ قلم سے سر کھپاتا معلوم ہوا۔ میں نے مئو کی مناسبت سے ایم۔نسیم اعظمی کی جو خیالی پیکر تراشی کی تھی، وہ اس کے بالکل برعکس تھے۔ درمیانہ قد، بھاری جسم، خوش خوراکی کی چغلی کھاتی کچھ باہر کو اُبھری ہوئی توند، شباہت پر سادگی و پُرکاری کا ملمع، آنکھوں میں شفقت و مروّت کی چمک، شکن آلود پیشانی پر متانت کی لہریں اور لبوں پر خلوص و اخلاق کی مسکراہٹیں رقصاں تھیں۔

ڈاکٹر ایم۔نسیم اعظمی سے میری پہلی ملاقات کافی خوشگوار رہی، حالانکہ اُن کا چہرہ ہر قسم کے تاثر سے یکسر عاری یا یوں کہہ لیں کہ ہینگ چلے کھیت کی طرح بالکل سمتھل اور سپاٹ تھا۔ جس سے اُن کے بطون میں جاری ہلچل کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ مگر میں نے اُن کی چُپ گوئیوں اور حرفِ مطلب سے شخصیت کی کئی پرتیں اخذ کرلی تھیں۔ بہر حال، وہ ایک شاعر، ادیب اور مدیر کی حیثیت سے متعارف ہوئے تھے۔ چنانچہ میرے لیے انتہائی محترم، مکرّم اور معظّم تھے۔ میں نے ایم۔نسیم اعظمی صاحب سے 'مئو' کے ادبی منظرنامے پر گفتگو کرنا چاہا تو انہوں نے بجائے کچھ کہنے کے بیگ سے ''ادبی گزٹ' کا پہلا شمارہ برآمد کیا اور میرے حوالے کردیا۔ میں موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے، جریدے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس دوران انہوں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''رکھ لیجئے، اطمینان سے مطالعہ کیجئے گا، آپ کو مئو کا ادبی منظرنامہ کچھ حد تک سمجھ میں آجائے گا''۔

ورق گردانی کے دوران میں نے دیکھا شعری حصّے میں زیادہ تر مئو کے شعراء کی غزلیں اور نظمیں شامل تھیں۔ اس سے مجھے اندازہ ہو چلا تھا کہ مئوناتھ بھنجن میں شعراء خاصی تعداد میں ہیں جبکہ چند ایک مضمون نگار بھی ہیں۔ ورنہ فضا ابن فیضی اور اثرؔ انصاری کے علاوہ کوئی اور نام سُنا نہ ہی کسی رسالے میں دیکھا تھا۔ البتہ اُردو اکادمیوں کے رسائل میں کبھی کبھار ڈاکٹر ایم۔نسیم اعظمی کی غزلوں کے علاوہ تحقیقی یا تنقیدی مضامین ضرور مطالعے میں آتے رہے تھے۔ بہر حال! ہمارے درمیان تادیر گفتگو کا سلسلہ رہا، جس میں زیادہ تر میں اور عرفان صاحب ہی بولتے رہے اور نسیم صاحب خاموشی سے ہمارے کہے کو اپنی سماعت میں جذب کرتے رہے تھے، البتہ وقفہ وقفہ سے کچھ اس انداز سے ہاں۔۔۔ ہوں یا ایک سطری سوال کرلیتے جیسے دادی یا نانی سے کہانی سنتے ہوئے بچّے ہنکاری بھرتے ہیں اور درمیان میں جہاں قصّہ گو یادوں کو مجتمع کرنے کی خاطر پل بھر کو ٹھہر جاتا ہے تو بچّے ''پھر کیا ہوا'' کہہ کر اپنی بیداری کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ایم۔نسیم اعظمی صاحب کم گو، کم سخن سہی لیکن کردار کے غازی تھے، گفتار کی ذمہ داری انہوں نے اپنے قلم کو سونپ رکھی تھی، لہٰذا قلم خوب بولتا تھا، اس قدر کہ قلم کی آواز صفحہ قرطاس پر نقش ہوہو کر ان پر بسیار نویسی کی مہر ثبت کرتی رہی۔ میری اس بات کی تصدیق انہوں نے اپنے ایک شعر میں کچھ یوں کی ہے ؎

اکیلے میں ذرا پڑھ کر سمجھنا
کہ میں تنہائیوں کی گفتگو ہوں

یہی تنہائیاں اور تکلّم کی خاموشی نے انہیں اکثر و بیشتر ہستی کے موہوم سفر میں تنہا تنہا ہی رہنے دیا نیز جہاں بینی، جہاں داری، جہاں گیری اور ہوائے خودسری کا ذائقہ چکھنے سے باز رکھا، تاکہ وہ اپنے خوابوں کو ہی بلندیٔ افکار سمجھتے رہیں اور زمانے کی آشنائیوں، حالات کی شناسائیوں کو محض لفظوں کی بیساکھی پر ٹانگے رکھیں۔ اس بات میں دو رائے نہیں کہ خاطرِ آزردہ کی تسکین سے ناواقفیت کے باوجود خودنمائی اور خودپرستی پر انہیں یقینِ کامل تھا۔ یہی یقین مصلحت کی کڑی سے کڑی

دھوپ میں بھی ان سے نہ صرف ہمّت کا شامیانہ تنواتا رہا، بلکہ زوال کے در پہ عروج کی دستک دینے پر اُکساتا رہا اور وہ گھٹن کی میز پر حِصارِ حرف میں شعور کے سرکش خیال کو پیرو کر جینے کے تیور سے روشناس ہوتے رہے۔ حالانکہ زندگی حاسدِ کم ظرف کی طرح انہیں درج کر رہی تھی اور وہ آئینۂ ظرف کی مانند زندگی کو نقش کرتے رہے تھے۔ نتیجتاً ۱۹۹۸ء سے ۲۰۱۷ء کے درمیان تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی کُل سولہ تصنیفات وجود میں آئیں اور مقبولِ عام ہوئیں۔ ان میں بیشتر کتابوں کو اُتر پردیس اور بہار کے اُردو اکادمیوں نے انعامات سے نوازہ بھی۔

میرا جب بھی گاؤں جانا ہوتا، پتہ نہیں کیسے عرفان جونپوری صاحب کو اطلاع ہو جاتی اور وہ فوراً ٹیلی فونک رابطے میں آجاتے اور سرِ دست جونپور آنے کا نیوتا دے دیتے، البتہ دِن تاریخ کا تعین مجھ پر چھوڑ دیتے۔ میں اپنی سہولت کے مطابق دِن اور وقت بتا دیتا۔ پھر اُس دِن صبح سے ہی ہر گھنٹہ آدھ گھنٹہ پر عرفان صاحب کا فون برسرِ گفتار ہو جاتا۔ ''ارے بھائی گھر سے نکل چکے؟۔۔۔ بس مِل گئی ؟۔۔۔ کون سی بس ہے؟۔۔۔ پاٹھک بس سروس یا پرمار ٹرویلس؟''۔

غرض کہ وہ ساری جانکاری حاصل کر لینے کی در پہ ہوتے تا کہ وہ پتہ کر سکیں کہ مطلوبہ بس کتنے بجے سیاہ بس اڈّے پر پہنچتی ہے۔ یہی سبب ہے جیسے ہی میں بس سے اُترتا اُنہیں اپنا منتظر پاتا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی لپک کر میرے قریب آتے اور تپاک سے گلے لگ جاتے۔ پھر سائیکل رکشا کی سواری سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہم ان کے مکان کے احاطے کے باہر اُترتے، اور میں اُس مخصوص کمرے کا رُخ کرتا جو ظاہری طور پر تو لائبریری ہے مگر حقیقتاً ورک شاپ اور آفس کے طور پر استعمال میں لایا جاتا ہے۔ کمرے کی دہلیز پر پہنچتے ہی نگاہیں ایم۔ نسیم اعظمی صاحب کو اونگھتے ہوئے پاتیں۔ مجھے خوشگوار حیرت ہوتی کہ موصوف مئوناتھ بھنجن سے جونپور تک غالباً ۱۲۵ کلومیٹر طویل مسافت طے کرنے کے بعد بھی مجھ سے پہلے پہنچ آئے۔ جبکہ مجھے محض پچاس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے میں خاصا وقت درکار تھا۔ ایسا غالباً تین یا چار مرتبہ ہوا۔ ہر بار تشویش حواس پر غالب آجاتی، گمان شعور سے اُلجھ پڑتا، فکر احساس کے دائرے میں گردش کرنے لگتی کہ یہ شخص ایک عالمی مجلہ ''ادبی گزٹ'' کا مدیر، ماہرِ تعلیم، بہترین شاعر، پائے کا نقّاد اور مستند محقق ہوتے ہوئے بھی کس قدر ادب دوست اور ادب نواز ہے کہ عرفان صاحب کی ایما پر مجھ حقیر فقیر بے وقعت آدمی جو ابھی آدمیت کی اوّلین پائیدان کو بھی نہیں پہنچا ہے، محض اس سے ملاقات کی خاطر مئو سے جونپور!۔۔۔ وہ بھی سوا سو کلومیٹر کی مسافت؟؟۔ بہر حال! بعد کو پتہ چلا کہ یہ سب محض میرا بھرم تھا۔ ڈاکٹر ایم۔ نسیم اعظمی کا مسکن مئو ضرور ہے لیکن موصوف برائے معاش 'مدرسہ رفیق الاسلام' سے وابستہ ہیں، جو گورا بادشاہ پور میں واقع ہے۔ یاد رہے کہ گورا بادشاہ پور اور جونپور کے درمیان محض ساڑھے تیرہ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔

ڈاکٹر ایم۔ نسیم اعظمی صاحب گورا بادشاہ پور، ضلع جونپور میں واقع ایک معمولی سے مدرسہ 'رفیق الاسلام' میں غالباً اٹھارہ بیس برس تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ حالانکہ تعلیمی لیاقت، ادبی صلاحیت وقابلیت کے بوتے انہیں کسی ڈگری کالج یا یونیورسٹی کا پروفیسر ہونا چاہئے تھا۔ افسوس صد افسوس کہ حالات کی کشاکش نے محض مدرس کی شناخت عطا کی۔ بہر کیف! اللہ کی مرضی اور مقدر کے لکھے پر کسی کا کیا اختیار؟ لیکن مدرسہ کو تو اس بات پر فخر وگمان ہونا چاہئے تھا کہ اس کے وجود سے ایک ایسا قابل، لائق وفائق اُستاد وابستہ ہے جو نہ صرف تعلیمی سند رکھتا ہے بلکہ ادب میں ڈاکٹریٹ بھی ہے۔ علاوہ ازیں عظیم شاعر، تنقید نگار اور محقق ہونے کے ساتھ ساتھ ماہرِ تعلیم بھی ہے، جس کی شہرت کا ڈنکا محض اُردو دُنیا میں ہی نہیں، چار دانگ میں بجتا ہے۔ حیف! کہ مدرسہ نے اِن کی قدر نہ جانی اور تادمِ مرگ انہیں ایک تعلیمی حمّال سے زیادہ اہمیت نہیں دیا۔ جی ہاں! فی زمانہ ملک بھر میں موجود زیادہ تر مدرسوں کا یہی حال ہے کیونکہ انتظامیہ میں دولت مند جہلاء کی بہتات ہے۔ وہ مدرس کو معمارِ قوم نہیں مزدور اور بیگار سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر نسیم نے شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا ہے ؎

آدمیت آدمی سے دور ہے
زندگی کا بھی عجیب دستور ہے

بہر حال! ڈاکٹر ایم۔ نسیم اعظمی نے اپنے پیشے کے وقار کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ مدرسے میں آنے والے نونہالوں کو ہمیشہ دِل وجان سے عزیز رکھا اور ان کی ذہنی آبیاری اور شعوری پرداخت کی خاطر اپنے جگر کو لہولہان کرتے رہے۔

زبان وادب کا سودا کم عمری ہی میں ایم۔ نسیم اعظمی کے سر میں سما چکا تھا۔ غالباً سترہ برس کی عمر میں ہی انہوں نے مئوناتھ بھنجن سے ایک

ماہنامہ ''ادب نکھار'' کے نام سے جاری کر دیا تھا۔جس کی ادارتی ذمہ داری ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۹ء تک بہ حُسن وخوبی نبھاتے رہے۔بعد ازاں ۱۹۸۹ء سے ماہنامہ ''ادب نکھار'' کو ہفت روزہ کر دیا ،لہٰذا مصروفیت اور ذمہ داری دوچند ہوگئی ،دو چار مہینے تو بھلا لگا ،پھر طرح طرح کی دقتیں درپیش آنے لگیں ،لیکن جوشِ جنوں تھا کہ سپر ڈالنے کو تیار ہی نہ تھا۔آخر کب تک؟ بہت ہمّت باندھا تو دو سال سے آگے نہ بڑھ سکے اور ہار کر ۱۹۹۱ء میں ہفت روزہ 'ادب نکھار' پر فاتحہ پڑھ دیا۔

ایم۔نسیم اعظمی ہمّتِ مرداں کے قائل تھے،شاید اسی سبب انہیں مددِ خدا مِل جایا کرتی تھی،اور وہ اسی سہارے بڑے بڑے معرکے تنہا سر کر جایا کرتے تھے۔کہتے ہیں وہ ایک نفری فوجی دستے کے خود ساختہ سپہ سالار رتھے اور سپاہی بھی۔اسی بنا پر انہوں نے فروغِ ادب کی خاطر وہ وہ کام کر دیے جو آج تک بڑی بڑی تنظیمیں اور انجمنوں نے نہیں کیا۔کرنا تو دور کی بات،اس تعلق سے سوچا تک نہیں ۔یقیناً اب کچھ حاسد ذہن ضرور یہ سوچ رہے ہوں گے کہ آخر ایسا کون سا کارنامہ انجام دے دیا بجز ایک ماہنامہ یا ہفت روزہ نکالنے اور دو چار کتابیں لکھ مارنے کے۔تو دوستو! عرض کر دوں کہ جب 'ادب نکھار' اپنی عمر کے پانچ سال مکمل کر چُکا تو انہوں نے ''نکھار ادبی ایوارڈ کا اجراء کیا جو گولڈ میڈل پر مشتمل تھا جو سال بہ سال کسی ایک ادیب یا شاعر کو تاعمر ادبی خدمات کے اعتراف میں تفویض کیا جاتا رہا۔جب اس میں اقربا پروری کا الزام لگنے لگا تو انہوں نے ۱۹۸۵ء میں اس سلسلے کو روک دیا۔۱۹۸۰ء میں انہوں نے ''نکھار پبلی کیشن'' کی بنیاد بھی ڈال دی تھی ،جو بحسن وخوبی گیارہ برس تک جاری رہا،اس پبلی کیشن کے زیر اہتمام کل چونسٹھ علمی ،ادبی اور تنقیدی کتابوں کی اشاعت عمل میں آئیں۔سولہ برس تک مسلسل کل ہند وصوبائی سطح کے مشاعروں،ادبی سیمیناروں اور صحافتی مذاکروں کا بحیثیت سکریٹری اور کنوینر انعقاد کرتے رہے۔پانچ برس تک ضلع پتر کار سمیتی ،مئو ناتھ بھنجن کے جنرل سکریٹری رہے۔آٹھ برس تک 'پروانچل ادبی فورم' کے صدر رہے۔سات برس تک ''حراء ایجوکیشنل اینڈ کلچرل سوسائٹی' رجسٹرڈ 'اور ''حراء پبلک اسکول'' جمال پورہ، مئو کی نظامت کی۔۲۰۱۰ء تا مرگ ''اثر انصاری اکیڈمی''،مئو ناتھ بھنجن کے نائب صدر کے عہدہ پر فائز رہے۔جنوری ۲۰۱۰ء میں ہی عالمی اُردو مجلہ ''ادبی گزٹ'' کا اجراء کیا اور آپ کی ادارت میں اب تک کل سات ضخیم شمارے شائع ہوئے ہیں۔اس کے بعد ''تخلیق وتحقیق'' کے نام سے سہ ماہی کا اجراء کیا لیکن اس کی ادارت کی ذمہ داری اپنے شاگردِ عزیز ظہیر حسن ظہیر کو سونپی۔

ادھر تین چار سال سے طبیعت میں اضمحلال در آیا تھا۔مدرسہ میں جی نہ لگتا تھا۔مہینے بھر کی چھٹّی لے لی۔خوب آرام کیا،یعنی ایک کتاب وجود میں آ گئی۔خیر! دوائیں بھی لیتے رہے۔لیکن افاقہ ہونا تھا نہ ہوا۔ہار کر پی جی آئی لکھنؤ گئے۔جانچ ہوئی،ایک گُردے میں کینسر کی تشخیص ہوئی۔گُردہ بے طرح متاثر ہو چکا تھا۔ڈاکٹروں نے آپریشن کے ذریعے متاثرہ گردہ ہی نکال باہر کیا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری! چند دنوں بعد طبیعت کچھ بحال ضرور ہوئی لیکن اضمحلال نہ گیا۔سال بھر کسی نہ کسی طرح مدرسہ آتے جاتے رہے۔اس دوران انہوں نے محسوس کیا کہ زندگی جس قدر جینا تھی جی چُکے ،اب شاید ڈھلان پر ہیں۔زندگی کی بیاض سے ایک ایک دِن کٹتے جا رہے ہیں۔چنانچہ انہوں نے مدرسہ سے والینٹری ریٹائرمنٹ لینے کی ٹھانی۔شریک حیات اور احباب سے مشاورہ کیا پھر کاغذی کاروائی میں اُلجھ گئے۔کیونکہ وہ بھلی بھانتی جانتے تھے کہ اِن کی موت کے بعد گھر کے افراد کو مدرسے سے فنڈ اور پنشن حاصل کرنے کے لیے کاغذی خانہ پُری کرنے کی خاطر ناکوں چنے چبانے پڑیں گے۔اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ان کی زندگی ہی میں سارے کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام کو پہنچ گئے۔

اس دوران دو دفعہ علی گڑھ گئے۔وہاں کے علاج سے قدرے افاقہ ہوا۔مشیّتِ الٰہی کے آگے کب کس کی چلی ہے۔اچانک طبیعت بگڑی اور ۱۷/اکتوبر ۲۰۱۹ء کا دِن ان کے لیے زندگی کا آخری دن بن گیا۔اللہ تبارک وتعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔آمین۔پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹی عدیلہ نسیم ہیں۔آپ نے ادب میں ڈاکٹریٹ کر رکھا ہے۔اس لحاظ سے قوی اُمید ہے کہ وہ اپنے والدِ مرحوم کے کام کو آگے بڑھائیں گی اور ان کا جاری کردہ مجلہ ''تخلیق وتحقیق'' کو پابندی سے جاری رکھیں گی۔

☆☆☆

صحافت کی اخلاقیات اور خبروں کے اقدار

ڈاکٹر مصطفیٰ علی

اسسٹنٹ ایڈیٹر (اردو)، پبلی کیشن ڈویژن، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی۔ موبائل: 8299535742

صحافت کی اخلاقیات اور خبروں کے اقدار، یہ دونوں ہی وہ رہنما اصول ہیں جن پر ہر صحافی اور میڈیا اداروں کو عمل کرنا بے حد ضروری ہے۔ اور یہ اس لیے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو ایمان داری، دیانت داری اور پیشہ ورانہ طریقے سے انجام دے سکیں۔ یہ اصول معاشرتی اعتماد کو برقرار رکھنے اور حقائق پر مبنی خبروں کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے انتہائی ناگزیر ہیں۔ اخلاقیات اور اقدار دونوں ہی انسانی زندگی کے ایسے بنیادی اصول ہیں، جو انفرادی اور اجتماعی رویوں کو تشکیل دیتے ہیں۔ ان کا تعلق انسانی کردار، عمل اور معاشرتی تعلقات سے ہوتا ہے۔ یہ دونوں ہی ایک بہتر اور متوازن معاشرہ تشکیل دینے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اخلاقیات سماجی نظم وضبط برقرار رکھتی ہے اور اقدار افراد کو اپنی زندگی کے مقاصد و ترجیحات طے کرنے میں رہنمائی کرتے ہیں۔ اخلاقیات ایک مثبت اصطلاح ہے جو اچھے برے، صحیح غلط اور انصاف و ناانصافی کے اصولوں کا مطالعہ کرتی ہے۔ اخلاقیات پر مبنی اصول عام طور پر عالمی ہوتے ہیں اور افراد کو ہر شعبے میں رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ صرف صحافت ہی نہیں بلکہ اکثر شعبہائے علم وفن (معیشت، سیاست، معاشرت وغیرہ) ایسے ہیں جن کی ناک میں اگر اخلاقیات کی نکیل نہ پڑی ہو تو وہ منہ زور ہو کر ایسی تباہی مچائیں گے کہ افراتفری، انتشار، مایوسی، تصادم اور محاذ آرائی کا ماحول پیدا ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد میڈیا کے پتنگ کو صحافتی اخلاقیات کی ڈور سے باندھ کر اڑانے کی حمایت ہمیشہ ہوتی رہی ہے تاکہ حالات کی مطابقِ واقعہ رپورٹنگ ممکن ہو سکے۔ بہرحال یہاں کسی کے ذہن میں یہ بات پیدا ہو سکتی ہے کہ یہ اختیار تو خبر بنانے یا نشر کرنے والی ایجنسی کے پاس ہوتا ہے تو پھر اس میں عوام کیا کرے۔ دراصل غیر معیاری اور من گھڑت معلومات عوامی رائے کو آلودہ کر دیتی ہیں، اس لیے ان کے خلاف بڑے پیمانے پر محاذ آرائی کی ضرورت ہے تاکہ ان کے گلے میں صحافتی اخلاقیات کی رسی پڑ جائے اور ان کا کھلے سانڈ کی طرح بے گناہوں کو سینگ مارنا بند ہو جائے۔ لہٰذا ان کے آمرانہ نظریے (Authoritarian Theory) میں صحافتی اخلاقیات کی کیمیائی کارروائی کر کے اسے سماجی ذمہ داری کے نظریے (Social Responsibility theory) میں تبدیل کرنا بے حد ضروری ہے۔ تو آیئے پہلے ہم صحافت کی اخلاقیات کو ٹھیک سے سمجھ لیتے ہیں، اس کے بعد اقدار پر توجہ مرکوز کی جائے گی۔

صحافی کا ضابطۂ اخلاق یا صحافت کی اخلاقیات دونوں تقریباً ایک ہی چیز ہیں، جس کو مختلف لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ 'نیشنل یونین آف جرنلسٹس' کے نام سے اکثر صحافی متعارف ہوں گے۔ اسے 1907 میں قائم کیا گیا تھا اور یہ آئرلینڈ اور برطانیہ بھر کے 38000 صحافیوں کی یونین ہے۔ اس سلسلے میں اس کے متعین کردہ نکات بہت حد تک صحافت اور صحافیوں کی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس کے کوڈ آف کنڈکٹ یا ضابطۂ اخلاق کے مطابق 12 نکات ایسے ہیں جن کی پابندی ارکان یا صحافیوں کو کرنا ضروری ہے۔

ان نکات میں سب سے اہم نکتہ ایمان داری اور سچائی ہے۔ صحافی کو چاہیے کہ وہ ہمہ وقت آزادیِ میڈیا کے طے کردہ اصولوں کی مدافعت کے ساتھ ساتھ عوام کے حق کا بھی خیال رکھے اور وہ ہے انھیں درست خبر مہیا کرانا۔ وہ منصفانہ معلومات کو یقینی بنائے۔ خبر کی حقیقت اور اپنے ذاتی تجزیے میں فرق رکھے۔ خبر کے لیے مواد حاصل کرنے میں عوامی مفاد کو مقدم رکھے اور سچائی کے ساتھ ثبوت حاصل کرے۔ عوامی مفاد کے تحت کسی کی نجی زندگی، غم یا تکلیف میں سے خبر تلاش کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اپنے ذرائع کی شناخت کسی پر ظاہر نہ کرے، اسے خفیہ رکھے۔ دھمکیوں کو برداشت کرے اور اپنے کسی ذاتی لالچ یا فائدے کے لیے معلومات کو عوام تک پہنچنے سے نہ روکے۔ کسی شخص کو عمر، جنس، رنگ ونسل، معذوری، قانونی حیثیت، ازدواجی حیثیت یا اس کے جنسی رجحان کی بنیاد پر اس کے ساتھ امتیازی سلوک نہ کرے۔ کسی نابالغ بچے سے گفتگو، انٹرویو کرنے سے پہلے اس کے والدین یا سرپرست کی رضامندی ضرور حاصل کرے۔ کسی قسم کی رپورٹنگ کرتے ہوئے یا تصویر کی حصولیابی یا پھر حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے سے احتراز اور رشوت لینے سے قطعی پرہیز کرے۔ کسی معاملے میں ملزم گردانے گئے بچوں اور جنسی جرائم کی شکار ایسی خواتین جو باحیات ہوں ان کی شناخت ظاہر نہ کرے۔

اس کے علاوہ "آل انڈیا نیوز پیپر ایڈیٹرس کانفرنس" نے اخبارات میں کام کرنے والے ہندوستانی صحافیوں کے لیے جو کچھ ضابطۂ اخلاق منظور کیے ہیں اور "پریس کونسل آف انڈیا" نے میڈیا کے لیے جو چند رہنمایانہ اصول بنائے ہیں، اگر ان سب کو بھی اس فہرست میں شامل کرلیا جائے تو کل نکات مندرجہ ذیل ہوں گے:

1۔ایمان داری 2۔سچائی 3۔آزادی 4۔درستگی 5۔منصف 6۔معتمد 7۔جوابدہ 8۔مثبت نقطۂ نظر کا حامل 9۔ حالات کے مطابق واقعات کی رپورٹنگ 10۔غیر جانب داری 12۔سرقہ (Plagiarism) سے پرہیز 13۔ذاتی بغض وعناد سے دوری 14۔حرص وطمع سے کنارہ کشی 15۔سوقیت وفحاشی پرونے سے اجتناب 16۔مفادِ عامہ کا خیال 17۔رشوت خوری سے احتراز 18۔قانون سے واقفیت 19۔بغیر تحقیق یا ثبوت کے کسی فرد یا شخصیت کے خلاف کوئی بات آگے نہ بڑھانا 20۔عوام کے مسائل کو اجاگر کرنا اور ان کے حل کے لیے ہر سطح پر آواز اٹھانا 21۔بے لاگ ولپیٹ خبر دینا 22۔تشدد کے واقعات کی مدح سرائی سے پرہیز کرنا 23۔فرقہ وارانہ جذبات ومنافرت، بغض وعداوت، اشتعال انگیزی اور نفاق پیدا کرنے والے مواد کی اشاعت سے بچنا 24۔حقائق اور تبصرہ وتجزیہ میں فرق کو ملحوظ رکھنا 25۔فحش اور بے لطف زبان کے استعمال سے بچنا 26۔قومی اور بین الاقوامی مسائل کا منصفانہ تجزیہ 27۔احتساب 28۔ذاتی رازداری کا احترام۔

صحافیوں کو چاہیے کہ اپنے مشاہدے اور بات کی گہرائی تک پہنچنے کی صلاحیت میں اضافے کے لیے سماج میں ہونے والی تبدیلیوں پر نظر رکھے، دوسرے اخبارات ورسائل میں جو کچھ لکھا جارہا ہے اس پر غور کرے اور عوام سے مسلسل رابطے میں رہے۔اپنی تحریروں میں عوامی سمجھ کے حساب سے آسان زبان کا استعمال کرے۔اس کے ساتھ ساتھ صحافت کے پانچ اشاعتی اصولوں پر بھی اپنی توجہ ضرور مرکوز رکھے ورنہ اسے حوالے کے طور پر استعمال کرنے میں دقتیں پیش آئیں گی۔یہ پانچ اشاعتی اصول درج ذیل ہیں:

1۔تاریخ 2۔جائے اشاعت 3۔جلد اور صفحہ 4۔اشاعت نمبر 5۔قیمت۔ایک صحافی کو دھیان دینا چاہیے کہ یہ پانچوں نکات اخبار کے سرورق پر مندرج ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو اپنے ادارے کی توجہ اس طرف مبذول کرانا اس کی ذمہ داری ہے، ورنہ اس کے ادارے کے ساتھ اس کی بھی شناخت مجروح ہوگی۔

مذکورہ بالا صحافتی اصولوں کو اگر اپنا لیا جائے تو ہر ملک کی صحافت کا معیار اعلیٰ ہوسکتا ہے۔خاص طور سے اردو اور ہندی صحافت کا، کیوں کہ ان کی صورتحال زیادہ ابتر ہے۔اس وقت اردو صحافت کی جو صورتحال ہے، اس سے ایسا لگتا ہے کہ اس کا کام ہمیں اغیار کے ظلم کی مبالغہ آمیز داستانیں یا ماضی کی عظمت کے قصیدے سنا کر جھوٹے فخر و مباہات میں مبتلا کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔صحافت کا کام سماج اور معاشرے کا آئینہ بن کر اس کی ترقی میں معاونت کرنا اور بدلتے حالات اور تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھال کر درپیش چیلنجوں کا مقابلہ کرنا بھی ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ وہ ابھی بھی اپنی پرانی لیک پر ہی چلی جارہی ہے بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ وسائل کی کمی کا شکار ہوکر اس نے اپنے معیار کو مزید گرا لیا ہے۔اردو صحافت کے پیشہ ورانہ اخلاقیات سے عاری ہونے کی متعدد مثالیں مولانا وحیدالدین خان نے اپنے مضمون 'اردو صحافت اور اخلاقیات' میں پیش کی ہیں جو کہ انور علی دہلوی کی کتاب 'اردو صحافت' میں شامل ہے۔اسی میں ایک جگہ انھوں نے طنزاً کہا ہے کہ:

"اردو صحافت ایک قسم کی وکیلانہ صحافت ہے نہ کہ کوئی اخلاقی صحافت۔"

بڑے ہی افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ اردو صحافت پر لکھے متعدد مضامین کو پڑھنے اور صورتحال کا مشاہدہ کرنے پر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اردو صحافت اخلاقیات کی پاسداری نہیں کرتی اور نہ ہی وہ صحافتی اخلاقیات کے معیاروں پر کھرا اترتی ہے۔جب کہ یہ بات مسلم ہے کہ پرنٹ اور الکٹرانک میڈیا سماج پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اس سے دو قدم آگے نکل کر عوام کی ذہن سازی اور رجحان سازی بھی کرتا ہے۔وہ عوام کے اندر شعوری بیداری اور تحریک پیدا کرتا ہے، اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ملک وقوم کی تعمیر وترقی میں ان کے اہم کردار کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے۔لہٰذا ان کو اپنا انداز ہمیشہ مثبت رکھنا چاہیے۔اگر وہ ایسا نہ کریں تو جس طرح کسی بڑے سے بڑے آئینی عہدے پر بیٹھے شخص کا مواخذہ ہوتا ہے اور ان پر مقدمات قائم ہوتے ہیں، اسی طرح صحافیوں کی غلطیوں پر بھی سزا عائد ہونی چاہیے تاکہ پیشہ ورانہ اخلاقیات کو بروئے کار لانے کی روش صحافت (بطور خاص اردو) میں عام ہوسکے۔

صحافت کی اخلاقیات کے ساتھ ساتھ خبروں کے اقدار (NEWS VALUES) کو بھی جاننا اور انھیں ملحوظِ خاطر

رکھنا ایک صحافی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ ان دونوں میں سے کسی کو بھی نظر انداز کرنا صحافت کو کمزور کرنے اور اپنی صحافتی ذمہ داریوں سے فرار اختیار کرنے کے مترادف ہوگا۔

کسی اخبار کو مختلف جوانب و ذرائع سے جو خبریں موصول ہوتی ہیں ان میں سے کون سی خبر اہم اور کون سی غیر اہم مانی جائے گی اس کا انحصار خبر میں موجود اقدار پر ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی کسوٹی ہے جس پر خبر کو رکھ کر پرکھنے سے اس کا اہم اور غیر اہم ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ 1998 میں "ماسٹرٹن" (MASTERTON) کے بین الاقوامی سروے نے خبر کے کچھ دلچسپ اور اہم نقطوں کو متعین کر کے اسے عوام سے متعارف کرانے کی ایک کامیاب کوشش کی، جنھیں ہم ''خبر کے اقدار'' (NEWS VALUES) کے نام سے جانتے ہیں۔ اس سروے میں آٹھ نکات (POINTS) کو News Values میں شامل کیا گیا تھا۔ جس میں بعد کے لوگوں نے اضافہ بھی کیا اور اب خبر کے تقریباً گیارہ اقدار بیان کیے جاتے ہیں۔ خبر کے ان اقدار سے ہر صحافی کا واقف ہونا ناگزیر ہے، ورنہ انھیں خبر اور غیر خبر کے عناصر کو پہچاننے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ ایسے میں جو واقعہ خبر بننے کے قابل نہیں ہوگا اسے بھی وہ دفتر میں پیش کر دیں گے اور اپنے لیے ذلت و رسوائی کا سامان تیار کر لیں گے۔ کبھی کبھی تو نیوز روم میں نیوز یونٹ کو رپورٹروں کی بے تکی و مضحکہ خیز رپورٹنگ دیکھ کر ٹھہا کہ لگانے کا من کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مرتبہ کسی رپورٹر نے اپنے بیٹ میں مرے ہوئے کسی گوری نامی بھینس کی خبر نیوز یونٹ کو ڈکوڈ کی تھی۔ اسی طرح ایک صحافی نے اپنے بیٹ میں ہو رہے ایک معمولی میچ کی رپورٹ بھیجی تھی اور اس میں 'گورکا' کی سینچری کی خاص طور پر قصیدہ خوانی کی تھی۔ ایسی مضحک صورتحال صرف اس وجہ سے پیش آئی کیوں کہ صحافی خبروں کے اقدار سے ناواقف تھا۔ اس لیے ہر صحافی کو اپنی ناک بچانے کے لیے ان اقدار سے واقف ہونا بے حد ضروری ہے۔ خبر کے وہ اقدار مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ تبدیلی (change):- تبدیلی تقاضائے فطرت ہے اور اس کے اثر سے انسان مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مختلف اوقات میں اس کا معیار و مقدار مختلف ہوتا ہے۔ تبدیلی کی سطح جتنی بلند ہوگی، وہ جتنی مسافت طے کرے گی اور جتنے زیادہ لوگوں کو اپنی چپیٹ میں لے گی، خبر کے اقدار کے لحاظ سے اتنی ہی زیادہ اہم اور قیمتی مانی جائے گی، جیسے ڈیجٹلائزیشن۔

2۔ تصادم (Conflict):- تصادم خبر کے اقدار کا ایک اہم جزو ہے۔ تصادم یا تو وقوع پذیر ہو چکا ہو یا اس کا امکان ہو دونوں ہی صورتوں میں خبر بن سکتی ہے۔ تصادم دو طاقتوں، فرقوں یا ملکوں میں ہو سکتا ہے۔ آئڈیالوجی کا تصادم ہونا بھی بعید از قیاس نہیں۔ مختلف پارٹیوں اور فرقوں کا وجود اس کا بین ثبوت ہے۔ لڑائی جھگڑا، کھیل کود، جنگ، مظاہرہ، انتخابات اور جرم سے بھی اکثر کشیدگی و تشویش کی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے اور یہ سب خبر بن سکتی ہیں۔

3۔ حادثہ یا آفات (Disaster):- آفاتِ آسمانی ہو یا حادثاتِ انسانی، اسے خبر کی قدر میں شمار کیا جائے گا۔ مثلاً جنوری 2001 میں گجرات میں آیا زلزلہ یا 2005 میں ہندوستان سمیت کئی ملکوں میں سنامی سے ہوئی تباہی اور 26/11/2008 میں ممبئی کے تاج ہوٹل میں ہوا دہشت گردانہ حملہ یا پھر اگست 2017 میں بہار میں باڑھ سے ہوئی بربادی۔ ان سبھی سے بڑے پیمانے پر خبریں بنتی ہیں۔ اب اس میں بھی کس خبر کو کتنی اہمیت دی جائے یہ اس کے تناسب میں کمی و زیادتی کے حساب سے متعین کیا جائے گا۔

4۔ ترقی یا پیش رفت (Progress):- ترقی یا پیش رفت سے انسان کا آگاہ ہونا بے حد ضروری ہے تاکہ وہ بھی زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو بھی خبر کی قدر گردانا گیا ہے۔ ترقی و پیش رفت کسی بھی شعبے سے جڑی ہو مثلاً ٹیکنالوجی، نئی دواؤں کی کھوج، زرعی آلات کا ایجاد یا دیگر موضوعات جس سے سماجی مفادات وابستہ ہوں، سب خبر بن سکتے ہیں۔

5۔ اسباب (Causes):- کسی بھی واقعے کے وقوع پذیری کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ اسباب ظاہر بھی ہو سکتے ہیں اور پوشیدہ بھی۔ اسبابِ ظاہری تو فوراً منظر عام پر لایا جا سکتا ہے مگر اسبابِ باطنی کا پتہ لگانا پڑتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ پہلے کسی واقعے کے وقوع پذیر ہونے کا کچھ اور سبب بتایا جاتا رہا ہو اور بعد میں کسی دوسرے اور حقیقی سبب کا انکشاف ہو جائے جو واقعے کا رخ ہی پلٹ کر رکھ دے۔ یہی وجہ ہے کہ اسباب سے انسان کی فطری وابستگی ہوتی ہے، اس لیے اسے بھی خبر کی قدر مانا گیا ہے۔

6۔ امکانات، نتائج (Consequences):- کسی واقعے کا امکان یا اس کے مہلک نتائج معاشرتی تانے بانے کو متاثر کر سکتا ہے، اس لیے اگر اس کا خوف بھی ہو تو بھی سماج کا اس سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ جیسے تیسری عالمی جنگ کا امکان یا اسے روکنے کی

سمت میں کی گئی کامیاب و ناکام کوشش وغیرہ۔

7۔تمکنت/امتیازیت(Prominence):- کسی بھی معزز شخص کا کسی واقعے سے جڑنا، الجھن یا لپیٹ میں آجانا اس واقعے کو اہم بنا دیتا ہے۔ جتنی ہی اہمیت کی حامل شخصیت ہوگی خبر کی قدر اتنی ہی بلند ہوگی۔ مثال کے طور پر ستمبر 2002 میں سلمان خان کا Hit&RunCase میں پھنسنا اور امیتابھ بچن و نواز شریف کا پناما کیس میں ملوث ہونا یا اپسٹن فائل (Epstein Files) کیس وغیرہ۔

8۔قرب مکانی(Proximity):- جس واقعے سے قارئین کی جغرافیائی اور ثقافتی قربت ہوگی وہ ان کے نزدیک زیادہ اہم ہوگی اور ان سے وہ زیادہ متاثر ہوں گے۔ وہ حالیہ دنوں میں فلسطینیوں پر ہو رہی بمباری ہو یا لاس اینجلس، امریکہ کے جنگلات میں لگی آگ کی تباہی۔ یا پھر جو سانحہ 4/اگست 2020 کو لبنان کے دارالسلطنت بیروت کے ویئر ہاؤس میں امونیم نائٹریٹ کے دھماکے سے وقوع پذیر ہوا، اس نے لبنانیوں کے دلوں پر جتنے گہرے نقوش ثبت کیے ہوں گے، علاقائی دوری کے سبب اتنے گہرے اثرات ہمارے دلوں نے شاید ہی قبول کیے ہوں یا 4 جنوری 2026 کو وینزویلا کے صدر نکولاس مادورو اور ان کی اہلیہ کو امریکی افواج کے ذریعے گرفتار کیے جانے سے وینزویلا والے جتنا متاثر ہوئے ہوں گے یا جو اہمیت اس واقعے کی ان کے نزدیک رہی ہوگی، ظاہری بات ہے ہمارے یہاں اس سے لوگ اس شدت سے نہیں جڑ پائیں گے لیکن ہوسکتا ہے وہ وہاں کئی اخباروں کی شہ سرخی (banner) بھی بنی ہو۔ لہذا وہ زلزلہ ایک اہم خبر تو بنی پر جغرافیائی بعد کی وجہ سے اس کی شدت میں یہاں کمی رہ گئی۔

9۔قرب زمانی(Timeliness):- خبر کی ایک تعریف یہ بھی بتلائی گئی ہے کہ وہ تیزی سے فنا ہونے والی شئے ہے، اس لیے جتنی جلدی ہو سکے یہ لوگوں تک پہنچ جانی چاہیے۔ پرانی یا باسی خبروں کی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ رپورٹر یا نامہ نگار کو بھی اس بات پر توجہ دینی چاہیے کہ وہ تازہ خبروں کی جستجو میں سرگرداں رہے، باسی خبروں کے چکر میں نہ پڑے ورنہ یہ صورتحال ان کے قارئین یا ناظرین کی تعداد میں کمی کا سبب بنے گی۔

10۔انسانی دلچسپی(Human Interest):- خبر کا خاص تعلق انسان سے ہی ہے۔ اسے انسان ہی انسان کے لیے بناتا ہے۔ خبر کا ایک پہلو ایسا بھی ہوتا ہے جو انسانی جذبات میں ہیجان برپا کر دیتا ہے۔ اگر کوئی ایسی چیز یا ایسا حادثہ نظر آئے جو انسان کو اندر تک دہلا دینے والی یا جھنجھوڑنے والی یا پھر رومان پیدا کرنے والی ہو تو اسے خبر کے زمرے میں رکھا جائے گا، کیوں کہ ایسے موضوعات انسانی دلچسپی سے تعلق رکھتے ہیں۔ کرائم، ایڈونچر، سانحہ اور غیر معمولی کامیابی وغیرہ کی خبریں بھی انسان دلچسپی سے پڑھتا، سنتا اور دیکھتا ہے۔ اس لیے انسانی دلچسپی کو بھی خبر کی ایک قدر تصور کیا گیا ہے۔

11۔انوکھا پن(Novelty):- کچھ عجیب یا مضحکہ خیز انسان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، جیسے انسان کا کتے کو کاٹنا یا بندر کا کار چلانا وغیرہ۔ اس کی طرف انسان کی رغبت کے پیشِ نظر ہی اسے خبر کی قدر متعین کیا گیا ہے۔

یہی خبر کے اقدار ہیں اور اس کے عناصر و لوازمات بھی۔ صحافت کی تعلیم و تربیت سے وابستہ مشہور مرکز "تھامس فاؤنڈیشن" کے مطالعاتی گروپ نے بھی خبر کے لیے ضروری پرکشش اور دلچسپی کے مدنظر کل بیس اجزا و اقدار کا انتخاب کیا ہے، جن میں سے بیشتر وہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔ اس کے علاوہ اس گروپ نے دولت، مذہب یا فرقہ، سائنس، تفریح، صحت عامہ، غذا اور اجناس، راز یا تجسس، اقلیت، مشہور و معروف اور اہم شخصیات، موسم، طنز و مزاح، جرائم، جذباتیت، جنسیات وغیرہ کو بھی خبر کے لوازمات میں شامل کیا ہے۔

ماہرین نے تشویش، تجسس، تعداد، اہمیت، ایجادات، مہم جوئی، ثقافت، دفاع، بھائی چارگی، سماجی و معاشی تبدیلیوں کو بھی خبر کے اقدار کے طور پر قبول کیا ہے۔ لیکن جو 11 نکات اوپر تفصیل سے بیان ہوئے ہیں وہی زیادہ اہمیت کے حامل ہیں لہذا انھیں ہمیشہ دھیان میں رکھنا چاہیے۔

خبر کے متذکرہ بالا اقدار ایک طرح سے خبر کے پرکھنے کا پیمانہ ہیں جس کو جاننے کے بعد صحافی کے اندر "خبر کے شعور" (News Sense) کا فروغ ہوتا ہے اور وہ ہر الم غلم واقعے پر اپنا وقت ضائع کرنے سے بچ جاتا ہے۔ ان اقدار پر عمل پیرا ہو کر کوئی بھی صحافی جلد ہی اپنے اسٹاف کی توجہ کا مرکز بن سکتا ہے ورنہ اسے Cub ہی کہا جاتا رہے گا۔ کسی خبر میں یہ سبھی یا ان میں سے کئی اقدار موجود ہو سکتے ہیں۔ جس خبر میں جتنے زیادہ اقدار ہوں گے وہ خبر اتنی ہی زیادہ اہمیت کی حامل ہوگی۔ کس خبر کو شائع کیا جائے اور کسے ضائع، اور کس خبر کو کس صفحہ کے کس مقام پر کتنی جگہ ملے، اس کا فیصلہ بھی یہی متذکرہ بالا اقدار کرتے ہیں۔

ہونا تو یہ چاہیے کہ ہر اخبار اور چینل خبر کے انھیں اقدار کی روشنی

میں خبر کے خبر ہونے، نہ ہونے اور ان کے مقام کا تعین کرے لیکن مفاد پرستی کے چکر میں بہت سے اخبارات اور نیوز چینلوں نے خبر کے ان متعینہ اقدار کو نظر انداز کر کے اپنے غیر تحریر شدہ اصول گڑھ لیے ہیں۔ وہ اپنے انھیں من گھڑت اصولوں کے تحت اہم کو غیر اہم، بڑی کو چھوٹی اور ضروری کو غیر ضروری یا اس کے برعکس بنا کر پیش کرتے رہتے ہیں اور کچھ میڈیا والے تو خبروں پر اپنے تعصب کی ملمع کاری کر کے قارئین و ناظرین و سامعین کا BrainWash کرنے کا گھٹیا کارنامہ بھی انجام دیتے رہتے ہیں، ایسے میڈیا کے لیے "گودی میڈیا" کی اصطلاح وضع ہو گئی ہے۔ اب وہ زمانہ ہی لد گیا جب اخبار کا معاشرے پر بہت اثر ہوتا تھا اور اس کو لوگ توپ سے بھی زیادہ طاقتور ہتھیار سمجھتے تھے، وہ سہمے ہوئے لوگوں کے دلوں میں انقلاب کی آگ بھڑکا کر حکومت کا تختہ پلٹ دیا کرتا تھا۔ جب سے اس کا ریموٹ کارپوریٹ کے ہاتھوں میں پہنچا ہے، لوگ اس کے نام پر ہنستے ہیں۔ یہ زیادہ پیسہ کمانے کے چکر میں سنسنی خیز خبریں پھیلاتا ہے یا پھر اس میں الٹے سیدھے اشتہارات کی بھرمار بھی ہوتی ہے۔ اس طرح کے اخبار مالکان کو شاید یہ بھی خبر نہیں کہ آجکل ان کے اخبار بچوں کی غلاظت صاف کرنے، اس کی پڑیا بنا کر سامان دینے، اسے بچھا کر اشیا رکھنے یا پھر اس سے دسترخوان کا کام لیا جانے لگا ہے۔ خیر، جو خبروں کے اقدار اور صحافت کی اخلاقیات کی پرواہ نہیں کرتے، ان کا حشر یہی ہوتا ہے۔

جہاں کہیں بھی میڈیا اداروں میں اس طرح کے حالات بنتے ہیں وہاں صحافت کی اخلاقیات اور خبروں کے حقیقی اقدار کی پیروی کرنے والے صحافی و نامہ نگار گھٹن محسوس کرتے ہیں، کیوں کہ وہاں ان کا علم صرف کتابی علم بن کر رہ جاتا ہے۔ خیر وہ کر بھی کیا سکتے ہیں؟ کیا یہ مناسب ہوگا کہ وہ اخبار مالک یا چینل مینیجر کے خلاف جا کر اور ان کے خود ساختہ اصولوں کو ٹھینگا دکھا کر خبروں کے اقدار کی حفاظت کریں اور اپنی نوکری اور جان دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا خطرہ مول لیں یا مصالحت کا کوئی راستہ نکالیں؟ کیا ہم نہیں جانتے کہ کتنے صحافیوں نے صحافت کی اخلاقیات و اقدار کی پیروی میں اپنی جانیں گنوا دیں؟

اگر وہ خبروں کے اقدار کی حفاظت کے لیے ایسے جرأت مندانہ قدم اٹھائیں تو بحیثیت ایک بے دار عوام کے کیا ہم ان کے شانہ بہ شانہ اس لڑائی میں کھڑے ہوں گے یا ان کے ہونے والے نقصان سے انھیں بچانے کے لیے آگے آئیں گے؟ ہمیں خود سوچنا چاہیے کہ اس بے بسی کے عالم میں انھیں کیا کرنا چاہیے؟ کچھ میڈیا گھرانوں کی گھٹیا پالیسیوں کی وجہ سے معاشرے میں منافرت اور فرقہ واریت کو فروغ ملتا ہے۔ صحافت کی اخلاقیات اور خبروں کے اقدار پر عمل کرنا کوئی آسان کام نہیں، لیکن ان اصولوں پر عمل کرنے سے صحافت اپنی ساکھ کو مضبوط بنا سکتی ہے اور عوام کے اعتماد کو بحال کر سکتی ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ایک ذمہ دار صحافت ہی جمہوریت کے استحکام اور معاشرتی انصاف کے فروغ میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

کتابیات:

1۔ سید اقبال قادری، رہبر اخبار نویسی، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، ۲۰۰۰۔

2۔ شافع قدوائی، خبر نگاری (باب اول)، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۸۔

3۔ اردو صحافت، مرتبہ: انور علی دہلوی، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۸۷۔

4۔ ابلاغیات، محمد شاہد حسین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۴۔

5۔ سمیع الرحمن، رپورٹنگ: فن اور طریقۂ کار، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۶۔

6۔ کمل دیکشت و مہیش درپن، سماچار سمپادن، رادھا کرشن پرکاشن، ۲۰۰۹۔

7۔ قیوم نظامی، کالم: میڈیا اور ضابطہ اخلاق، نوائے وقت، لاہور، ۱۸ نومبر ۲۰۱۷۔

8۔ زاہد امروز، مضمون: صحافتی اخلاقیات اور پاکستانی میڈیا۔

9. National Union of Journalists: Code of conduct, NUJ London Magazine Branch.

10. Kamal Shankar Srivastava, Principles of Indian Journalism And Mass Communication, APH Publishing Corporation Daryaganj New Delhi, 2007.

11. Stephanie Craft and Charles N. Davis, Principles of American Journalism: An Introduction (Chapter:6,7,8), Routledge Publication UK, 2013

12. Kelly McBride & Tom Rosenstiel, The New Ethics of Journalism: Principles for the 21st Century, CQ Press, 2013.

13. International Survey of Masterton, 1998.

14. Veer Bala Aggarwal, Essentials of Practical Journalism, Concept Publishing Company, Mohan Garden, New Delhi, 2006.

15. K.M. Shrivastava, News Reporting and Editing, Sterling Publishers,Greater Noida U.P., Revised Edition 2015.

16. N. Jayapalan, Journalism, Atlantic Publishers & Distributers Daryaganj New Delhi, 2001.

☆☆☆

صفدر امام قادری کی کالم نگاری

محمد اویس سنبھلی
نعمانی پرنٹنگ پریس، گولہ گنج لکھنؤ، موبائل:7905636448

صحافت کی تاریخ میں کالم نویسی ایک ایسا درخشاں باب ہے جو قارئین کے ذہنوں کو جگمگا تا رہتا ہے۔ یہ صنف نہ صرف حالات حاضرہ کی آئینہ دار ہے بلکہ سیاسی، سماجی اور ادبی مسائل پر اظہار کا ایک منفرد ذریعہ بھی۔ اس کی جڑیں اردو صحافت کی ابتدائی تاریخ سے جڑی ہوئی ہیں۔ مولانا ظفر علی خان (1873-1956) کو اردو صحافت کا امام کہا جاتا ہے، انھوں نے اپنے اخبار ''زمیندار'' میں سنجیدہ کالم نگاری کے ساتھ مزاحیہ اور طنزیہ کالموں کی نئی روایات قائم کیں۔ ''اودھ پنچ'' نے بھی ظرافت کے موتی بکھیرے، جبکہ آزادی کے بعد ''قومی آواز'' کی ''گلوریاں'' نے قارئین کو مسحور کیا۔ ''سیاست جدید'' کانپور میں سلامت علی مہدی نے کالم نگاری کی بنیاد رکھی۔ ہفت روزہ ''ندائے ملت'' اور ''عزائم'' نے عتیق الرحمن سنبھلی، ڈاکٹر آصف قدوائی، جمیل مہدی، حکیم عبدالقوی دریابادی، حسن واصف عثمانی اور حفیظ نعمانی جیسے قلم کاروں کو جنم دیا۔ تخلص بھوپالی کے مزاحیہ کالم بھی 'ندائے ملت' میں خوب شائع ہوتے تھے۔ یہ اردو صحافت کے جواہر تھے جن کے ہزاروں کالم اخبارات کے صفحات میں دفن ہیں، مگر ان کی روشنی آج بھی زندہ ہے۔ آج کل حسن کمال، شمیم طارق، معصوم مرادآبادی، سہیل انجم، شکیل رشید، ودود ساجد، ریحان غنی، ارشد ندیم، سید احمد قادری، سہیل وحید، عمیر کوٹی ندوی، یامین انصاری وغیرہ کے کالم سیاسی اور معاشرتی مسائل پر گہری نظر رکھتے ہوئے قارئین کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اسی سلسلہ کا ایک بہت نمایاں نام ڈاکٹر صفدر امام قادری کا ہے۔

صفدر امام قادری اردو ادب کے ایک منفرد نقاد، محقق، کالم نگار اور ادیب ہیں، جن کی تحریریں ادبی تنقید، صحافتی کالموں، سفرناموں اور تحقیقی مقالوں کی شکل میں سامنے آتی رہتی ہیں۔ وہ گزشتہ 30/ برس سے درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ فی الحال کالج آف کامرس، آرٹس اینڈ سائنس، پٹنہ میں شعبہ اردو میں پروفیسر اور ہیڈ ہیں۔ زبان وادب کے حوالے سے ان کی ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کی تحریروں کا بنیادی مرکز ادبی تنقید ہے، جہاں وہ اردو ادب کی تاریخ، لسانی ارتقا اور کلاسیکی متون پر گہرے تجزیے پیش کرتے ہیں۔ خود صفدر امام قادری نے بھی لکھا ہے کہ:

> ''ادب اور تدریس میں سر سے پا تک مشغول ہوجانے کے باوجود اس پہلی محبت کی ہی یہ طاقت ہوگی کہ میں وقفے وقفے سے صحافت کے صحرا میں چلا آتا ہوں''۔

صفدر امام قادری نے اردو کالم نگاری کی باقاعدہ ابتدا تو 2013 میں کی البتہ اس سے قبل وہ ہندی اور انگریزی صحافت میں بھی بحیثیت نامہ نگار خدمات انجام دے چکے تھے۔ اردو میں بھی کالم لکھتے تھے لیکن اس میں پختگی 2013 کے بعد آئی۔ تب سے لے کر آج تک وہ نہایت دلجمعی کے ساتھ کالم لکھ رہے ہیں۔ میرے سامنے ان کے کالموں کا مجموعہ ''جمہوری اداروں کا زوال'' ہے جسے ان کے لائق شاگرد قمر الزماں چمپارنی نے مرتب کیا ہے۔ اس سے قبل صفدر امام قادری کے کالموں کا ایک انتخاب 2018 میں ''عرض داشت'' عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ جسے محمد صابر رضا مصباحی نے مرتب کیا تھا۔ 592 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں کل 117 کالم شامل تھے، جو 2013 سے 2018 تک روزنامہ ''انقلاب'' کے لیے لکھے گئے۔ ہندوستان میں 2014 کے بعد سے جو سیاسی اتھل پتھل کا دور شروع ہوا، یا اقلیتوں اور خاص طور پر مسلمانوں کے خلاف جس طرح منصوبہ بند طریقہ سے عوام کے دل و دماغ میں زہر گھولا گیا، اس کے بعد اس ملک میں کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا۔ مسلمانوں سے وابستہ ہر ایک چیز کو ٹارگیٹ کیا جانے لگا۔ ایسے حالات میں ایک حساس ذہن والے انسان جسے اللہ نے قلم کی نعمت سے بھی نوازا ہو، رہنمائی کے لیے کیا کچھ لکھ سکتا ہے وہ سب ''عرض داشت'' میں پڑھا جاسکتا ہے۔ نیز اس میں اردو زبان کے تعلق سے بھی کئی کالم موجود ہیں۔ زبان وادب کے طالب علموں کے لیے یہ ایک قیمتی تحفہ ہے۔ بقول شفیع جاوید:

> ''صفدر امام قادری کے کالموں کی صورت دل کا دھواں اُٹھتا ہے، ہوش وخرد پر چھا جاتا ہے اور 'عرض داشت' کی صورت ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے اکثر مجھے بلیک پوئٹری اور بلیک لٹریچر کا مزاحمتی احساس بھی ہوا۔۔۔ 'عرض داشت' کے مصنف کو میں نے ادب کے اعلیٰ اور عالمی معیار سے ہمیشہ آشنا پایا ہے۔ ادب و تہذیب کا دل دادہ پایا ہے۔ رواداری اور دل نوازی کا حسین امتزاج پایا ہے۔''

''جمہوری اداروں کا زوال'' بھی اسی سلسلے کی دوسری کڑی۔اس کا دورانیہ 2018 سے 2025 ہے۔ 13 ابواب پر مشتمل اس کتاب میں صفدر امام قادری کے 100 کالموں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ ابواب کے عنوانات 'بابری مسجد مرحوم: آخری قضیے'، ''کانگریس: نئے دور کا انتظار''، ''حزب اختلاف: حقیقی نشانے سے دور''، ''فرقہ پرست سیاست کے داؤ پیچ''، ''اقتدار کا نشہ''، ''محروم طبقات کے حقوق''، ''اقتدار کی مطلق العنانیت''، ''جمہوری طریقۂ کار ہی واحد ذریعہ''، ''بہار: حکومت اور سیاست''، ''نئے سیاسی مورچے''، ''امارت شرعیہ: ایک صدی بعد''، ''اقلیت آبادی: قومی اور عالمی تناظر''، اور ''عالمی سیاست اور سماج'' سے ہی موضوعات کی گہرائی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کتاب کے مرتب قمرالزماں چمپارنی نے اپنے طویل مقدمے کے آخر میں صفدر امام قادری کے سیاسی کالموں کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس کتاب میں صفدر امام قادری کے اسو سے زائد مضامین شامل ہیں۔ الگ الگ وقتوں میں الگ الگ موضوعات پر یہ مضامین لکھے گئے ہیں مگر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ ان مضامین کی روح کا عنوان ''ضمیر کی آواز'' ہے۔ 'قلم گوید کہ من شاہِ جہانم' یا اکبرالہ آبادی نے لکھا: 'جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو' صفدر امام قادری نے ان مضامین بہت ساری توپوں اور تلواروں کا مقابلہ تنِ تنہا اپنے قلم سے کیا ہے۔ ایک ایسی بے خوفی کی فضا ہے جہاں کوئی لاگ لپیٹ نہیں ہے اور نہ ہی ایمان کے اصولوں سے ایک رتّی بھر انحراف کیا گیا ہے۔۔۔''

ڈاکٹر صفدر امام قادری کے کالموں میں ذہنی کشادگی، دور اندیشی، ملکی و عالمی مسائل پر گہری نگاہ، روح کی بے چینی اور ضمیر کا اضطراب جھلکتا ہے۔ وہ ناانصافی، ظلم اور جبر کے خلاف بے خوف ہو کر لکھتے ہیں۔ وہ ایک حساس قلم کار ہیں لہٰذا ان کے کالم ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال میں اقلیتوں کی رہنمائی کرتے ہوئے ان کے حساس ذہن کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں قارئین کو نئی سوچ اور سماجی تبدیلی کی دعوت دیتی ہیں۔ بقول شوکت حیات:

''مجھے اپنے چھوٹے بھائیوں کی نسل میں صفدر امام قادری جیسا ذہین ادیب اور سماجی اور سیاسی اعتبار سے باشعور اور لوجیکل انداز والا دانش ور دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ ادبی تنقید ہو یا سیاسی وسماجی ایکٹی وزم سے متعلق تحریری کارگزاری ہر جگہ صفدر امام قادری کا نپا تُلا گہرا اسلوب، انوکھا انداز تجزیہ دریا کے بہاؤ کی طرح نظر آتا ہے، جس کی لہریں کئی رُخوں اور تہوں کی طرف پڑھنے والے کے ذہن کو مرتکز کرتی رہتی ہیں۔''

ہندوستان کی سیاست اور یہاں کی سیاسی پارٹیوں خاص طور پر برسر اقتدار حکومت کی چال بازیوں، کمیونل ازم اور فاشسٹ رجحانات پر ڈاکٹر صفدر امام قادری کی تنقید نہایت کاٹ دار اور تلخ ہوتی ہے۔ ان کی کالم نگاری کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ غیر منطقی باتوں، منافقت اور آمریت کے پردوں کو چاک کرتے ہوئے ایسی کاری ضرب لگاتے ہیں کہ ہدف تڑپ اٹھتا ہے۔ میرے سب سے پسندیدہ کالم نگار حفیظ نعمانی صاحب تھے، جن کا امتیازی وصف ان کا کنایہ آمیز طنزیہ انداز اور تنقید کا بے باک لہجہ تھا۔۔

صفدر امام قادری نہ صرف ایک کالم نگار ہیں بلکہ اردو کی زندہ میراث ہیں، اور موجودہ زمانے میں صحافت کے ایک پاسبان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے قلم کی روشنی سے اردو کی دنیا مزید تابناک ہوتی رہے گی۔ ''جمہوری اداروں کا زوال'' میں ایسا لگتا ہے گویا ان کے قلم نے اپنی ساری توانائیاں اور شعور نے اپنے سارے خزانے سمیٹ کر ایک جگہ جمع کر دیے ہیں۔ اس اہم کام کی ترتیب و اشاعت کے لیے برادرم قمرالزماں چمپارنی ہر طرح سے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر صفدر امام قادری کی یہ بڑی خوبی ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کی پوشیدہ صلاحیتوں کو بھانپ لیتے ہیں، پھر فطری استعداد کے مطابق ان کی تربیت فرماتے اور علم کی بھٹی میں تپا کر انھیں کندن بنا دیتے ہیں، اور سعادت مند شاگرد احسان شناسی اور وفاداری کے اظہار کے طور پر استاد کی بکھری ہوئی تحریروں، ان کے علمی و ادبی خزانے کو محنت اور سلیقے سے سمیٹ کر کتابی شکل میں محفوظ کر دیتے ہیں۔ آج کے دور میں ایسے اساتذہ اور ایسے شاگرد خال خال ہی ملتے ہیں۔ اس لیے ایسے نایاب علمی تعلق اور ایسے بابرکت کام کو منظرِ عام پر لانے والے استاد اور شاگرد دونوں ہی قابل مبارک باد ہیں۔ ڈاکٹر صفدر امام قادری اور شاگردوں کا یہ رشتہ نہ صرف علم کی بقا کا ضامن ہے، بلکہ ادب و ثقافت کی زندہ روایت بھی ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے تمام اساتذہ اور شاگردوں کو مزید قوت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆

بزمِ اُردو سیتا پور: نصف صدی کا روشن سفر

عبدالقدوس ہاشمی

(جنرل سیکرٹری، مولانا آزاد میموریل اکادمی، لکھنؤ۔ موبائل: 9336984433)

پروفیسر مسعود حسن خاں نے اُردو کی پیدائش کو ایک غیر شعوری لسانی سمجھوتے سے تعبیر کیا ہے، جو اسلامی، ایرانی اور ہند آریائی زبانوں کی نمائندہ بولیوں کے درمیان صدیوں کے تاریخی عمل سے ظہور میں آتا رہا، اور جس نے ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے نہ صرف ہندوستان کی کثرت میں وحدت کی داغ بیل ڈالی بلکہ اپنی لسانی، علمی اور ادبی حیثیت بھی منوائی۔

اُردو خالص ہندوستانی زبان ہے۔ اس کی آبیاری میں ملک میں آباد رہنے والی تمام قوموں نے بلاتفریق مذہب وملت، رنگ ونسل، اسے سنوارنے اور نکھارنے میں مخلصانہ خدمات انجام دیں اور اپنی زندگیاں کھپا دیں۔ اسی مقصد کے تحت منظم شکل میں انجمنیں، اکادمیاں، کونسلیں اور بزمیں قائم کی گئیں، جنہوں نے اُردو کی ترقی اور ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ایسی ہی ایک بزم، جسے بزمِ اُردو سیتا پور کے نام سے آپ سبھی واقف ہوں گے، جس نے اُردو زبان وادب کے فروغ وخدمات میں اپنے 55 سال مکمل کر لیے ہیں۔ جبکہ اس نام موسوم بزم اردو لکھنؤ اور بزم اردو دبئی میں بھی واقع ہیں وہ بھی اسی فکر کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ اس بزم کے بانی جناب مست حفیظ رحمانی کے اردو ترانے کے یہ اشعار بزم کی فکری روح کے آئینہ دار ہیں:

اردو کے ہم شیدائی ہیں، اردو کے دیوانے ہم ہیں
بزمِ اُردو شمع ہماری، ہم اس کے پروانے ہیں
ساری زبانیں اپنی زبانیں، ہم نے یہی پیغام دیا
نفرت کی اس دھوپ میں بھی، ہم پیار کی چادر تانے ہیں

یہ وہ بزم ہے جس نے اردو ادب کے چراغ کو کبھی بجھنے نہیں دیا اور اس سب کے پیچھے مجاہد اردو محترم مست حفیظ رحمانی صاحب کی شخصیت اور سرپرستی رہی ہے، جن کی محنت، قربانی اور استقامت ہر قدم ہر گھڑی نظر آتی ہے۔ اگر بزم ایک عمارت ہے تو مست حفیظ رحمانی اس کی عمارت اور ستون ہیں۔ انہوں نے کئی نسلوں کو ادب اور تہذیب سے جوڑا، نامساعد حالات میں بھی اردو کے وقار کو کبھی کم ہونے نہ دیا۔ عکس معرفت ان کا شعری مجموعہ جس میں یہ مصرعہ ان کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے:

وہ چاند ہے تو عکس بھی پانی میں آ یگا
کردار خود ابھر کر کہانی میں آ یگا

بزم اردو سیتا پور اور مست حفیظ رحمانی کے کردار کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی خدمات کا اعتراف یوں تو صدر جمہوریہ ہند نے درس و تدریس میں ان کی نمایاں خدمات کا اعتراف کرانہیں اعلیٰ اعزاز سے نوازا اسی کے ساتھ مقامی اور غیر مقامی تنظیموں کے ساتھ سرکاری اداروں نے بھی انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ مولانا آزاد میموریل اکادمی لکھنؤ نے بھی نہ صرف اعتراف کیا بلکہ ان کے دو نعتیہ شعری مجموعہ عکس معرفت و پرتو عکس معرفت کی رونمائی لکھنؤ کے عظیم ادارہ اسلامک سینٹر آف انڈیا میں شہر نگاراں کی معتبر علمی وادبی شخصیات کی موجودگی میں کرانے کی سعادت حاصل کی۔ سرزمین سیتا پور میں بزم کے پچپن سالہ جشن کے موقع پر معززین شہر سیتا پور کی موجودگی میں ان کی اردو خدمات کا اعتراف کرا کادمی کی جانب سے انہیں "فخر اردو" ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ مورخہ 23 نومبر 2025 کو بزمِ اُردو سیتا پور کے 55 سالہ جشن میں معروف صحافی محترم احمد ابراہیم علوی، پروفیسر اکبر بلگرامی اور دیگر اہلِ علم و پاسبانِ ادب سیتا پور و لکھنؤ کے ساتھ، کثیر تعداد میں موجود محبان اُردو کی معیت میں اس تاریخی اور تحریکی اجلاس کا میں بھی گواہ رہا ہوں۔ نیز میں اراکین بزمِ اُردو کے حوصلوں اور جذبے کو سلام پیش کرتا ہوں، جنہوں نے محدود وسائل

اور مسائل کی پروا کیے بغیر اُردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں اپنا 55 سالہ سفر کامیابی سے طے کر کے ملک اور بیرونِ ملک میں ایک روشن مثال قائم کر دی اور یہ ثابت کر دیا کہ:

بزمِ اُردو، شمع ہماری
ہم اس کے پروانے ہیں

بزمِ اُردو سیتاپور صرف ایک ادارہ نہیں بلکہ ایک فکری کارواں ہے، جس نے کئی دہائیوں تک اُردو زبان و ادب کے چراغ کو روشن کر رکھا ہے، نئی نسل کو فکری تربیت دی اور گاؤں، قصبوں اور شہروں میں اُردو کی خوشبو پھیلائی۔ یکم جنوری 1970 کو مسلم جونیئر ہائی اسکول سیتاپور میں جناب مست حفیظ رحمانی کی دعوت و درخواست پر محبانِ اُردو کے علاوہ معززینِ شہر نواب ابراہیم حسن ملا سیتاپوری، سید محمد آفاق نقوی، سید میر علی جعفر چھدن میاں، ڈاکٹر نول بہاری مشرا، مرتضیٰ حسین ایوبی، امتیاز احمد ایوبی ایڈوکیٹ، ڈاکٹر رگھوبیر پرساد شریواستو، سید وسیم الحسن رضوی، عبدالشکور صدیقی، اقبال مجید، ڈاکٹر صمصام علی خاں، حاجی امیر اللہ میاں، شیخ عابد رضا ایڈوکیٹ اور رفیق احمد انصاری صاحبان کی سرپرستی میں بزمِ اُردو سیتاپور کا قیام عمل میں آیا۔ جس میں ڈاکٹر مسعود عارف سیتاپوری صدر، ثمر سیتاپوری، نثار حسین تاج، مقبل زید پوری نائب صدور، مست حفیظ رحمانی جنرل سیکرٹری، عارف محمود آبادی، نقی سیتاپوری سیکرٹری، چندریکا پرساد سنہا ایڈوکیٹ قانونی مشیر، علیم الدین خزانچی، مجاذ حنفی آڈیٹر اور طاہر سیتاپوری سیکرٹری نشر و اشاعت منتخب ہوئے اور اسی فکری سوچ کے ساتھ اس بزم کی بنیاد رکھی گئی کہ:

"اُردو محض زبان نہیں،
یہ تہذیب بھی ہے،
فکر بھی ہے،
اور سماجی رشتوں کی امین بھی۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب وسائل محدود تھے مگر شوق لامحدود، کاغذ کم تھے مگر خیالات بہت، سرمایہ کم تھا مگر زبان سے محبت بے پناہ تھی۔ اسی جذبے اور محبت نے بزم کو ایک ادارہ نہیں بلکہ ایک تحریک بنا دیا۔ ان پچپن برسوں میں بزمِ اُردو سیتاپور نے مختلف میدانوں میں نمایاں کارہائے انجام دیے۔ اُردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے درس و تدریس، اخلاقی و روحانی تربیت، ادبی محفلوں اور نشستوں کے ذریعے نہ صرف بڑے شاعروں کو سیتاپور سے جوڑا بلکہ نئی نسل کے شاعروں کی بھرپور حوصلہ افزائی بھی کی۔

بزمِ اُردو سیتاپور نے اس عرصے میں 1150 طرحی نشستیں، 1310 غیر طرحی نشستیں، 35 کتابوں کی رسمِ رونمائی کے علاوہ 20 کل ہند مشاعرے اور 20 قومی سطح کے اردو سیمینار منعقد کیے۔ اطراف کے کئی قصبات اور ٹاؤن ایریاز میں بھی عوامی مشاعروں کا اہتمام کیا گیا، جن میں عالمی شہرت یافتہ شعرا، ادبا، قلم کار، ذی علم حضرات اور سیاسی رہنماؤں نے شرکت کی۔ ان میں پدم شری پروفیسر قاضی عبدالستار، احمد جمال پاشا، تابش مہدی، ڈاکٹر مالک زادہ منظور احمد، کشفی لکھنوی، ساغر وارثی، علی جواد زیدی، مفتی رضا انصاری، رام لعل، مدرا راکشش، ساغر اعظمی، عادل لکھنوی، اقبال مجید، ڈاکٹر رضا رضوی، بیکل اتساہی، مولانا اسحاق سنبھلی، شفاعت علی سندیلوی، چودھری شرف الدین، شمسی مینائی، خمار بارہ بنکوی، کرشن بہاری نور، فنا نظامی، ڈاکٹر مخمور کاکوری، خورشید افسر نسوانی، ڈاکٹر بشیر بدر، تسنیم فاروقی، حق کانپوری، منظر بھوپالی، ڈاکٹر کلیم قیصر، وسیم بریلوی، حسن کاظمی، واصف فاروقی، ڈاکٹر طارق قمر، مرزا شارق لہرپوری، عصمت ملیح آبادی، حامد بہرائچی، رضوان فاروقی، جیلانی خان علیگ، مولانا عبدالعلی فاروقی، مولانا خالد رشید فرنگی محلی، شاہ عین الحید رعلوی، پرویز ملک زادہ، سردار چرن سنگھ بشر، ڈاکٹر انیس انصاری، سمیت سینکڑوں ادبا و شعرا شامل ہیں۔ یہی سے متعدد نوجوان شعرا نے اپنی علمی و ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ بزمِ اُردو سیتاپور نے علاقائی سطح سے کل ہند بلکہ عالمی سطح تک مشاعروں، ادبی محفلوں اور سیمینارز کے انعقاد کے ذریعے اُردو ادب کے فروغ میں مثالی کردار ادا کیا۔

تعلیمی میدان میں بزم نے گورنمنٹ انٹر کالج سیتاپور، ایچ کے پی انٹر کالج سیتاپور، میونسپل انٹر کالج سیتاپور اور کھیم کرن انٹر کالج لہرپور میں اُردو زبان کی تدریس کے لیے مؤثر اقدامات کیے۔ وہاں کے درجات اردو بطور مضمون داخل کرایا، اسی کے ساتھ عوام میں علم و ادب کے فروغ کے لیے مولانا آزاد اور مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے نام سے موسوم لائبریریوں کا قیام عمل میں آیا، جن میں مختلف موضوعات پر ان لائبریریوں میں پانچ ہزار سے زائد کتابیں موجود ہیں۔

ریاستی اور ضلعی سطح پر زبان وادب کے مقابلے، تقریری پروگرام، مضمون نویسی اور بزم کی تربیتی ورکشاپس نے اُردو کے طلبہ کو ایک مضبوط پلیٹ فارم فراہم کیا۔ بزم کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے معیاری رسائل، یادگاری شمارے اور تذکرے مقامی اور قومی ادیبوں کی خدمات کو محفوظ رکھنے کے ساتھ نئی نسل تک منتقل کرنے کا ذریعہ بنے۔

بزم نے ہمیشہ سماج میں امن، محبت، یکجہتی اور بھائی چارے کے پیغام کو عام کیا۔ یہی اُردو ادب کا بنیادی فلسفہ ہے۔ اُردو صرف حروف کا مجموعہ نہیں بلکہ دلوں کو جوڑنے والی زبان ہے۔ یہ وہ زبان ہے جس میں میر نے انسانی دکھ بیان کیے، غالب نے فکر کی وسعت دکھائی، اقبال نے نوجوانوں کو نئی دنیا بسانے کا حوصلہ دیا، اور فانی، چکبست، حسرت اور جوش نے اس کے دامن کو وسعت بخشی۔ بزمِ اُردو سیتاپور نے اُردو کے فروغ میں ایک طویل مسافت طے کر کے آنے والی نسلوں کے لیے یہ پیغام چھوڑا ہے کہ مادری زبان، اس کے ادب اور ثقافت کو کس طرح فروغ دیا جاتا ہے۔ یقیناً یہ خدمات تاریخِ اُردو میں سنہرے حروف میں لکھی جائیں گی۔ آج جدید ٹیکنالوجی کے دور میں بزمِ اُردو سیتاپور کی ذمہ داریاں پہلے سے کہیں زیادہ ہیں۔ نئی نسل تک ڈیجیٹل پلیٹ فارم، ای لائبریری، آڈیو بکس اور جدید اسالیب کے ذریعے اُردو کو پہنچانا، نوجوان لکھنے والوں کی تخلیقی تربیت، اور علاقائی ادیبوں کی تخلیقات کو قومی سطح تک لے جانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ پچپن سال کا سفر اپنی جگہ قابلِ فخر ہے، مگر صد سالہ جشن کے لیے اصل سفر تو اب شروع ہوتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ بزم اردو کی سرگرمیوں کو اسکولوں اور کالجوں تک لے جائیں، چھوٹے شہروں اور دیہات کے نوجوانوں کو شامل کریں اور اُردو کی ڈیجیٹل شناخت کو مضبوط بنائیں، کیونکہ ترقی انہیں قوموں کو ملتی ہے جو اپنی زبان اور تہذیب کی حفاظت کرتی ہیں۔

آخر میں بزمِ اُردو سیتاپور کے بانیان، سابق و موجودہ عہدیداران، شعرا، اساتذہ، طلبہ اور شہر کے تمام اہلِ ادب کو دل کی گہرائی سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ یہ پچپن سالہ سفر محنت، لگن، محبت اور استقامت کی روشن مثال ہے۔ دعا ہے کہ بزمِ اُردو سیتاپور ہمیشہ آباد رہے، ترقی کرتا رہے اور اُردو کے فروغ کا یہ چراغ جدید تقاضوں کے ساتھ روشنی بکھیرتا رہے۔

☆☆☆

غزل

گویا گلشن میں اک گلاب ہوں میں
سب کی آنکھوں کا انتخاب ہوں میں

صبح دم، مثلِ آفتاب ہوں میں
شام آئی تو ماہتاب ہوں میں

چشمِ آدم میں، جب کہ خواب ہوں میں
جگ مگر کیوں کہے خراب ہوں میں

کیسے کہہ دوں کہ لاجواب ہوں میں
ہاں مگر، تیرا انتخاب ہوں میں

تال ہوں، سر ہوں اور سوز بھی ہوں
راگ ہوں، ساز ہوں رباب ہوں میں

رت کوئی بھی ہو، راحتِ افزا ہوں
سبز و شاداب، دست یاب ہوں میں

بیٹیاں جب ہیں باعثِ رحمت
جگ میں کیوں باعثِ عذاب ہوں میں

جس کو سمجھا تھا اک صحیفہ جبیںؔ
طاق پر اک رکھی کتاب ہوں میں

☆☆☆

جبیں نازاں
دہلی۔ موبائل:9801315572

کلیم اللہ کلیمؔ دوست پوری کی غزل گوئی

ڈاکٹر احسان عالم

پرنسپل الحراء پبلک اسکول، دربھنگہ: 9431414808

محمد کلیم اللہ اپنے قلمی نام کلیم اللہ کلیم دوست پوری کے نام سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ 2/جولائی 1947ء کو ان کی پیدائش موضع دوست پور، کھجولی، کیلوآہی، مدھوبنی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سے اپنے والد محترم کی نگرانی میں حاصل کی۔ موضع کیلوآر ہی ضلع مدھوبنی میں واقع ٹی این ایچ ہائی اسکول میں داخلہ لیا اور 1963ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا سے بی۔ اے اور ایم۔ اے (اردو) کا امتحان پاس کیا۔ محکمہ صحت بہار میں ان کی تقرری ہوئی۔ شاعری کا آغاز طالب علمی کے زمانہ سے ہی کر چکے تھے لیکن باضابطہ شاعری 1970ء سے شروع کی۔ اصلاح سخن بین الاقوامی شاعر کیف عظیم آبادی اور واقف عظم آبادی سے لی۔ ان کے دو شعری مجموعے ''گلدستۂ کلیم'' (2017ء) اور ''سخن ہائے کلیم'' (2021ء) شائع ہو کر قارئین کے درمیان کافی مقبول ہوئے۔ کئی ادبی سرگرمیوں سے وابستہ رہے اور آج بھی ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے لئے انہیں کئی اعزازات اور انعامات سے نوازا گیا۔

کلیم اللہ کلیم دوست پوری ایک فعال، متحرک اور نیک صفت انسان ہیں۔ وہ دین اور دنیا دونوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ جہاں اردو زبان وادب کی خدمت میں دل سے لگے رہتے ہیں وہیں وہ دین کے تبلیغی کاموں میں بھی لگے رہتے ہیں۔ ضرورت مندوں کی ضرورتوں کا مکمل خیال رکھتے ہیں۔ وہ ایک انسان دوست، دین دار، مخلص اور ادب نواز شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ بے حد گداز دل اور حساس طبیعت کے مالک ہیں۔

کلیم اللہ کلیم کی شخصیت میں ایمانداری اس حد تک ہے کہ ان کے ایمانداری کی قسمیں کھائی جاسکتی ہیں۔ اپنی نوکری کے درمیان آپ نے اپنی تنخواہ پر قناعت اختیار کیا۔ ان میں انسانیت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ جب وہ پٹنہ میڈیکل کالج اسپتال میں ملازم تھے، جس نے بھی اپنا دکھ درد آپ کو بتایا اس کو حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ دوسری جگہوں پر جہاں مریضوں کا چکر لگانے پڑتے تھے وہاں کلیم اللہ کے یہاں اسے دوبارہ آنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اس خوبی نے آپ کو عوام وخواص میں کافی مقبول بنا دیا۔

کلیم اللہ کلیم دوست پوری ایک بے لوث سماجی خدمت گذار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خوش فکر شاعر بھی ہیں۔ وہ زندگی میں جس راہ کے مسافر ہیں اس کا تلخ وشیریں اظہار وہ اپنے کلام میں کرتے ہیں۔ موصوف دعوت وتبلیغ کے کاموں سے جڑے رہتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے کئی غیر ملکی سفر کئے ہیں۔ شہر عظیم آباد کی مساجد کی تعمیر نو اور بہترین نظم ونسق ان کی خوب تر انتظامی صلاحیتوں کے گواہ ہیں۔ کلیم اللہ کلیم کے کلام میں ہر قدم پر عشق مجازی کے رنگ رنگ نقوش سے زیادہ عشق حقیقی کے نقش ونگار نظر آتے ہیں۔ جس طرح موصوف کی غزلیں متاثر کرتی ہیں اسی طرح ان کی نظمیں بھی بے رغبتی دنیا کے مضمون سے عبارت ہیں۔ اس ضمن کے چند اشعار ایمان کی تازگی کو پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ کریں:

یہ نقش و نگار گلستاں، حسن و جمال داستاں
ہر شے میں تیرا عکس ہے، حسن زماں تو ہی تو ہے

☆☆

دلوں میں جن کے نبی کی محبت نہیں ہے
خدا کی قسم رب کو بھی ان سے الفت نہیں ہے

☆☆

کلیم اللہ کلیم دوست پوری نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے، انہوں نے غزل اور موضوعاتی نظمیں بھی لکھیں ہیں۔ آج کی شاعری میں جو حقیقت پسندی پائی جاتی ہے اس کو کلیم دوست پوری نے اپنی شاعری میں برتا ہے۔ موصوف کے بہت سے اشعار سہل ممتنع کا نادر نمونہ ہیں۔

جس زباں پہ ذکر خدا نہ ہو وہ زباں زباں نہیں ہے
ذرا سر جھکا کے دیکھو وہ کہاں کہاں نہیں ہے

☆☆

کیسی کیسی ہستیاں تھیں مل گئیں سب خاک میں
کل جہاں آبادیاں تھیں آج ہیں ویرانیاں

کلیم اللہ کلیم دوست پوری شاعری سے مالی منفعت کے خواہاں نہیں ہیں۔ اپنی شاعری کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''یہ کیا کم ہے کہ (شاعری) زندگی میں فرحت وتازگی عطا کرتی ہے، روح کو بیدار کرتی ہے، مردہ دلوں کو زندہ کرتی ہے، سوتے ہوئے احساس کو جگاتی ہے، حوصلہ بڑھاتی ہے اور بلندی عطا کرتی ہے، دلوں میں جوش وخروش پیدا کرتی ہے، اصول وضوابط کے مطابق زندگی گذارنے کا سلیقہ بھی سکھاتی ہے۔''

کلیم اللہ کلیم دوست پوری شاعر ہیں، ادیب ہیں، مبلغ ہیں۔ ان کے شعری مجموعہ ''گلدستۂ کلیم'' پر معروف ادیب، ناقد اور محقق پروفیسر سید شاہ حسین احمد اپنے تقریظ میں لکھتے ہیں:

''ادیب وشاعر تو بہت ملتے ہیں اور ادب بیزار بھی لیکن ادب نواز بہت کم ملتے ہیں، خوشی کی بات ہے کہ کلیم اللہ کلیم دوست پوری شاعر بھی ہیں، ادیب بھی ہیں اور ادب نواز بھی۔ کلیم صاحب نے ادب کے ساتھ ساتھ اپنے کو دین سے بھی جوڑے رکھا ہے۔ وہ نہ صرف دعوت کے کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں بلکہ کئی مساجد کی تعمیر وتوسیع میں بھی حصہ لیا ہے۔ شاہ ارزاں کالونی کی عظیم الشان مسجد ''ابوبکر مسجد'' ان ہی کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ کلیم صاحب ایک نیک صفت انسان ہیں۔ ضرورت مندوں کی مدد کرنا اور دوسروں کے کام آنا ان کی فطرت ہے۔''

(گلدستۂ کلیم، ص:17)

کلیم اللہ کلیم دوست پوری کی غزلیہ شاعری میں پند ونصیحت، درد وغم کی کیفیت، بیان کی سادگی اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ لہجے کی شیرینی پائی جاتی ہے۔ چند غزلیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم انتظار یار میں جاگے تھے رات بھر
پہلو میں جاکے سوئے تو خوابیدہ ہوگئے

دید کی حسرت لئے جب کوچۂ جاناں گیا
کتنے ہی چہرے وہاں پہ جانے پہچانے لگے

☆☆

ٹھکانہ نہیں کوئی اس زندگی کا
کہ انسان پانی کا ایک بلبلہ ہے

غزلیہ شاعری اب صرف حسن وعشق تک محدود نہیں ہے۔ یہ شاعری اب شعور عصر اور انسانی جذبات واحساسات کے کیف وکم سے مل کر دو آتشہ ہوگئی ہے۔ کلیم اللہ کلیم اپنے حساس دل میں عصری حسیت کے ساتھ اپنے گرد وپیش کے حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ سماجی رشتے میں بگاڑ، اخلاقی زوال، موقع پرست سیاست سے وہ کافی نالاں نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے ہر اشعار میں انسانیت کا پیغام دیتے نظر آتے ہیں۔ اس نوعیت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جو دنیا قید خانہ ہے یہاں بچ بچ کے چلنا ہے
ہوئے جو منہمک اس میں ذلالت ہو ہی جاتی ہے

☆☆

مصیبت کی گھڑی میں لوگ رشتہ توڑ لیتے ہیں
گر بیمار پڑ جائے تو کوئی غم خواں نہیں ہوتا
زندگی کو سنوارے رکھو دل میں کبھی نہ ملال رکھو
اگر نہ ہو یہ سرور دل میں تو پھر حلاوت نہیں رہے گی

☆☆

مفلسی آتی ہے تو ہوجاتے ہیں اپنے بھی بیگانے
یہ کیسے ہیں جو رشتہ توڑ کر بچھڑ جاتے ہیں لوگ

کلیم اللہ دوست پوری نے جس سلیقے سے اپنے احساسات، جذبات، مشاہدات اور تخیلات کو فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے، اس سے ان کی فکری آفاقیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے اسلوب وآہنگ سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لقمان سے جو پوچھا، آخر کیا ہے علاج عشق
کہنے لگے وہ مرض ہے، جس کی کوئی دوا نہیں

☆☆

رنجشیں اپنی جگہ، ہاتھ ملاتے رہئے
دل شکستہ سہی پر ساتھ نبھاتے رہئے

☆☆

کیوں طول شب فراق سے گھبرا گئے کلیمؔ
کیا ایسی بھی کوئی سب ہے جس کی سحر نہ ہو

نعت گوئی عشق رسول کے حوالے سے محتاط انداز بیان کی طالب ہوتی ہے۔ یہ عقیدت ومحبت کے درمیان اعتدال وتوازن کو ملحوظ رکھتی ہے۔ کلیم اللہ کلیم اس فن میں یکتا ہیں۔ وہ عاشق رسول ہیں اور اس پر نازاں بھی ہیں۔ ان کے چند نعتیہ اشعار ملاحظہ کریں اور غور کریں کہ انہوں نے اپنے دل کا حال کس طرح بیان کیا ہے:

ہم ہیں نازاں بہت اے شہہ انبیاء
آپ سا مل گیا ہم کو پیارا نبیؐ
جان سے ہم فدا کیوں نہ ہوں آپ ہر
نور ایماں دیا اور نئی زندگی
جب محمد کا مجھ پہ کرم ہے کلیم
تو نازاں نہ ہو کیوں رحمت ایزدی

جیسا کہ پہلے تحریر کر چکا ہوں کلیم اللہ کلیم کے دو شعری مجموعے ''گلدستۂ کلیم'' اور ''سخن ہائے کلیم'' ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کا کلام پاکیزہ خیالات کا خیاباں ہے۔ عام غزلیہ شاعری میں عشق ومحبت کے موضوعات کی کثرت ہوتی ہے لیکن کلیم اللہ کے کلام میں شاعری کا یہ غالب عنصر کیا ہے۔ وہ کوچۂ جاناں کا رخ تو کرتے ہیں لیکن جذبۂ ہجر ووصال بھی زبان پہ آتا ہے۔ لیکن خود ہی ان کا ذہن اس طرح مڑ جاتا ہے جس سے ان کی پوری شاعری عبارت ہے یعنی بے رغبتی دیا۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ کریں جو بے حد دلکش اور رنگ وآہنگ سے بھرپور ہیں:

تجھے کیا بتاؤں میں حال دل، کیا کشش ہے تیرے جمال میں
تو حسین وجمیل ہے اس قدر، کسے لاؤں تیری مثال میں
مری شام اگرچہ ڈھل گئی، کبھی صبح نو تو آئے گی
میں جی رہا ہوں اسی آس میں، کبھی آ تو میرے وصال میں

☆☆

تو ہے شاد ماں میں ہوں غم زدہ، تجھے فکر کیوں ہو کلیم کی
مری داستان الم ہے یہ، کٹی عمر رنج و ملال میں

اس طرح یقینی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کلیم اللہ کلیم دوست پوری، اردو دوست ہیں اور ان کی شخصیت ادب نواز شخصیت میں شمار کی جاتی ہے۔ آپ کی دو بین نظر دنیائے ادب پر مرکوز رہتی ہے اور دنیائے ادب بھی آپ کی تعظیم کرتی ہے۔

☆☆☆

غزل

ہر غم سے ہیں انجان چمکتی ہوئی آنکھیں
بے خوف ہیں بے باک چہکتی ہوئی آنکھیں

ہر لمحہ مرے دل میں نئے پھول کھلائے
معصوم سی بچپن میں مہکتی ہوئی آنکھیں

برہم ہیں اگر یہ تو قیامت کا ہے منظر
ہیں غیض میں شعلہ سی بھڑکتی ہوئی آنکھیں

شاید ہے کوئی درد سا سینے میں چھپائے
غمناک ہیں اشکوں سے چھلکتی ہوئی آنکھیں

لیکر تمہیں جانا ہے کہاں نازنینؔ اپنی
یہ شرم و حیا سے ہیں دمکتی ہوئی آنکھیں

☆☆☆

فرحانہ نازنینؔ
بیگوسرائے، بہار، انڈیا
موبائل:9470705183

عمیق حنفی کی نظم نگاری

مقصود خاں علیگ

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعی ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ موبائل: 8595687815

عمیق حنفی نے مختلف اصناف ادب میں طبع آزمائی کی ہے۔ مگر بنیادی طور پر وہ ایک نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی دنیائے ادب میں پہچان و شناخت ان کی نظموں کے ذریعہ ہی ہوئی ہے۔ عمیق حنفی کے کلام میں نظموں کے علاوہ تمام اصناف ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ ثانوی حیثیت رکھنے کے باوجود ان کی دیگر اصناف کا کلام ادبیت اور اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ عمیق حنفی کی نظموں کی زبان بہت آسان ہے۔ ان کی نظموں کو ایک عام قاری بھی آسانی سے پڑھ سکتا ہے۔ ان کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے اکثر اوقات لغت دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی، اس کے باوجود معنی تک رسائی دشوار ہوتی ہے۔ ان کی نظموں کی صفات میں ابہام معنی پہلی صفت ہے۔ اس صفت کا ان کی نظموں میں غالب اثر رہا ہے۔ چند ہی نظمیں ایسی ہوں گی جن میں اس صفت کا ظہور دیکھنے کو نہیں ملے گا ورنہ عام طور سے یہ صفت جا بہ جا اپنی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ جو عمیق حنفی کو اپنے معاصرین شعراء کے ایک جمگھٹ سے الگ کرتا ہے۔ اس عنصر کی بنا پر ہی عمیق حنفی کو ترقی پسند تحریک سے دور اور جدیدیت کے رجحان سے قریب سمجھا جاتا ہے۔ مگر عمیق حنفی نے خود کو ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے رجحان دونوں کے حامی اور ہمنوا بننے سے انکار کیا ہے۔ موصوف نے تادم مرگ خود کو نہ ترقی پسند اور نہ جدید شاعر کہا ہے۔ سن انیس سو ستر سٹھ میں جدیدیت والوں نے علی گڑھ میں ایک سیمنار یا جلسہ کا انعقاد کیا تھا۔ اور عمیق حنفی کو مدعو بھی کیا تھا۔ موصوف نے یہ سوچ کر وہاں جانے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ خود کو کسی تحریک یا رجحان کی حلقہ بندی الگ رکھنا چاہتے تھے۔ موصوف نے فیض ہر فکر و رجحان سے اٹھایا ہے مگر کسی فکر و رجحان کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا۔ اور نہ کسی فکر و رجحان کے وہ اسیر ہوئے۔

عمیق حنفی فرسودہ اور از حد مستعمل تراکیب سے اپنے کلام کو محفوظ رکھنے کی سعی کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی تراکیب کی بنیادی صفت ندرت اور جدت ہے۔ ان کی تراکیب میں نئے پن کے ساتھ تازگی مضمر ہے۔ ان کی تراکیب عموماً کم یاب یا کم مستعمل ہوتی ہیں۔ موصوف ندرت تراکیب سے اپنے کلام کو آراستہ کرنے کے لئے فکر مند رہتے ہیں:

اب بھی جاری ہے کج روئ فلک
چاند سورج زمین رقصاں ہے
وقت گردش میں اب بھی ہے لیکن
اب سحر پاؤڈر لگاتی ہے
اب لب شام پر لب اسٹک ہے [1]

دردر گھوم رہا ہوں لے کر آنکھوں کے کشکول (نظم تعارف، مجموعہ کلام شب گشت، ص 7)
"وقت کے تلووں سے قطرہ قطرہ خوں" (نظم ایک خواہش، مجموعہ کلام شب گشت، ص 10)
خواہش کی قندیل جلاتی ہے میری تحریر (نظم۔ تعارف ایضاً)
سن رہی ہو اینٹ پتھر کے سرکنے کی صدا (نظم۔ تجدید۔ مجموعہ کلام شب گشت ص 8)
خواب سے خالی ہیں آنکھیں، یاد سے خالی ہے دل (نظم۔ نغمہ شام)
قلب و ذہن و روح کی کشت سوال (نظم 66/11/3، مجموعہ کلام شب گشت، ص 31)
ٹھہرے پانی کی یہ میلی چادر (نظم۔ مداوا، مجموعہ کلام شب گشت، ص 29)

گھولتی ہیں انفس و آفاق میں نیلاہٹیں
(نظم۔زوال کا وقت، مجموعہ کلام شب گشت، ص26)
اور پھر آواز میں خوشبو کا رقص
(نظم۔جنگل: ایک ہشت پہلو تصویر، مجموعہ کلام۔شب گشت، ص21)
مرا دل بحر رقص موت کی تقطیع کرنا چاہتا ہے
(نظم۔ایک اماوس پوش نظم، مجموعہ کلام شجر صدا، ص56)

ان کی نظموں میں انگریزی اور ہندی الفاظ کی بھرمار ہے۔جس سے کلام تازگی، ندرت اور جدت کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں پر ایہام اور ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔اس ابہام کی وجوہات میں سب سے اہم وجہ کثرت ایہام ہے۔کلام اس کی زیادتی ہونے پر کلام حسن شعر کے لیے سم قاتل ابہام کا شکار ہو جاتا ہے۔اس خصوصیت نے ان کے کلام کو کہیں کہیں پر کمزور اور بے اثر کر دیا ہے۔گو کہ عمیق حنفی کے کلام کا اکثر حصہ اس قبیح صفت یا عیب سے پاک ہے۔واحد اس قبیح صفت کے ہلکے اثر سے ان کے کلام کو بے اثر اور لغو نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔صفت ایہام نے عمیق حنفی کی نظموں کو رفعت اور بلندی عطا کر دی ہے۔اس کے سبب سے ان کی نظمیں غیر معمولی بلاغت رکھتی ہیں۔چند مثالیں قلم بند کرتا ہوں:

صندل کے صابن کی خوشبو
شیمپو کیے ہوئے بالوں کی مادک گندھ
گدرائے انگوں کی موہک باس
پیراہن کے نام پر جو کچھ پہن رکھا ہے
نائلون کے اس کہرے کو
ایوننگ ان پیرس میں بسا کر
کلب ریستوان کیفے محفل چھوڑ چھاڑ کر
باغ باغ جنگل جنگل
پک نک کے پروگرام بنا کر
مس بہار آئی ہے 2؎

ان مثالوں میں شیمپو، مادک گندھ، انگوں کی موہک باس، ایوننگ ان پیرس، پک نک کے پروگرام جیسی تراکیب مستعمل ہیں جو اپنے اندر ندرت اور جدت رکھتی ہیں۔جس سے کلام میں اثر دوبالا ہو جاتا ہے۔دوسری طرف ان کی نظم "تشنج" کے چند مصرعے زیر قلم کرتا ہوں:

آج کس عالم میں ہیں احباب میرے
آنکھ میں تاب و تب و نم کچھ نہیں
دل؟ کسی ریفریجریٹر میں رکھے ہوں گے کہیں
جسم حاضر ہیں یہاں، غائب دماغ
مسکراہٹ: اک لپ اسٹک: خندہ پیشانی: نقاب!3؎

موصوف کی نظموں میں انگریزی اور ہندی الفاظ کا استعمال بر محل اور بلا تکلف ہوتا ہے۔ان کی نظموں میں دیسی اور انگریزی الفاظ نظم کی روانی کو متاثر نہیں کرتا بلکہ ان الفاظ کے استعمال سے روانی نظم میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔کمال یہ ہے کہ ان کی تمام نظموں میں ان الفاظ کی کثرت کے باوجود کلام میں کہیں پر بھی ثقالت اور قباحت پیدا نہیں ہوتی ہے اور کلام کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ان کی اس نظم "تشنج" میں ان الفاظ کی تکرار ہوئی ہے۔مثال کے طور پر لب اسٹک جیسے الفاظ کا استعمال جو انگریزی زبان کے ہونے کے ساتھ ساتھ بننے سنورنے کی ایک شئی یا آلہ ہے۔

نظم "نغمہ شام" کا ایک بند دیکھیں:

ذہن پر رکھی ہوئی ہے ایک کالی کالی سل
خواب سے خالی ہیں آنکھیں، یاد سے خالی ہے دل
کاش بھر دیتی ہلاہل ہی سے میرا جام
شام میری دشمن جاں شام 4؎

کتابیات:

1۔ انتخاب کلام عمیق حنفی، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، سن انیس سو چوسٹھ، کتابت زیدی لکھنوی۔طباعت۔کوہ نور پرنٹنگ پریس لال کنواں دہلی، ص:5
2۔ ایضاً، ص:7
3۔ مجموعہ کلام شب گشت از عمیق حنفی، ناشر شب خون کتاب گھر، اشاعت اول 1969 صفحہ 13
4۔ ایضا، ص:23

☆☆☆

اختر آزاد کا ناول ''جلتا پہاڑی سیّارہ'': ایک جائزہ

محمد طیب جمشید پوری

(ریسرچ اسکالر، مرکز مطالعاتِ اردو ثقافت، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔ موبائل: 9567246590)

گلستانِ اردو کی باغبانی میں ڈاکٹر اختر آزاد کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اسکول، کالج، یونیورسٹی، سمینار، رسائل، اخبارات، شمارے، ویب سائٹ، علمی اور ادبی حلقے میں وہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ افسانے کی پہچان کے ساتھ ساتھ قیام جھارکھنڈ کے بعد یہاں کے ناولوں کے بھی پہچان بن گئے۔ ان کی تحریر کی معنویت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہوتی ہے کہ ان کے افسانے نصاب میں شامل ہیں۔ اعلیٰ تعلیم میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ قیام جھارکھنڈ کے بعد صنف ناول کی طرف ان کی خاص توجہ رہی۔ ناول وقت، محنت اور حقیقت طلب صنف ہے۔ اس سے پہلے ان کے ناول کی کتابیں 'لمینیٹیڈ گرل' اور 'لاک تھری سسکٹی' مقبول ہوئیں۔ علمی حلقوں میں سراہا گیا اور اب ان کا تیسرا ناول 'جلتا پہاڑی سیّارہ' کے نام شائع ہوا۔

ڈاکٹر اختر آزاد نے اس ناول کو نیک بخت، سادہ لوح، محبت سے آشنا اور اسی کو جو متاعِ زندگی سمجھتے ہیں ان کی طرف منسوب کئے ہیں اس سے محبت اتحاد و اتفاق کا پیغام ملتا ہے ملاحظہ ہو:

> ''ان سادہ لوح انسانوں کے نام جو مذہب کی بساط پر سیاست کے نفرتی مہرے نہیں چلتے بلکہ محبت کو اپنا شیوہ اور امن و آشتی کو زندگی کا محور سمجھتے ہیں۔''

اس ناول میں منی پور کے دو قبیلے کے درمیان (کوکی اور میتئی) درمیان کشیدگی کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ذات پات کو لے کر سیاسی اور سماجی طور پر چھوا چھوت اور دشمنی کتنی گہری تھی۔ اس ذہنیت کو ایک پولس انسپکٹر کے ذریعے دکھایا گیا ہے۔ اس میں تاریخی حوالہ سے منی پور کے جغرافیہ کا ذکر ہے ساتھ ہی منی پور کے نام، اس کی وجہ تسمیہ، وہاں کے جنگی واقعات، قبائل اور مذہب کی نشاندہی، تجارتی سامان میں خاص طور پر منشیات، اسلحہ اور غیر قانونی کاروبار کا احاطہ کیا گیا۔ جنگلی جانوروں کا شکار، اس کے چمڑے اور دانتوں کی تجارت کے سسٹم کو نمایاں کئے ہیں۔ اس سے منی پور کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، تاریخی صورتِ حال سے پڑھنے والے واقف ہوں گے۔ فی الحال منی پور میں جو نا اتفاقی اور کشیدگی پیدا ہوئی تھی وہ قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھی۔ اس کی وجہ خاص ناول کے حوالے سے جو معلومات حاصل ہوتی ہے وہ ہمارے لیے معلومات افزا اور تاریخی دستاویز بھی ہے۔ میتئی سماج والے اپنے حقوق کی حصولیابی کے لیے اور منی پوری قبائلی درجہ دیئے جانے کا مطالبہ جس سے قانونی طور پر پہاڑی علاقہ میں انہیں بھی زمین کی خریداری کا کلّی حق حاصل ہو سکے۔ اِنہیں معاملات کے اُونچ نیچ اور گرما گرمی ہونے کی وجہ سے یہ قیامت خیز حالات پیدا ہوئے اور بڑی تعداد میں لوگوں کی جانیں گئیں اور پوری دنیا ایک ننگا ناچ دیکھی جو برسوں کی انسانی تاریخ اور انسانیت کو اکھاڑ پھینکا۔ منی پور کے حالات خراب ہونے کی ابتدا دو قبائلی سماج کے مطالبات اور حقوق کے استحصال سے ہوئی تھی۔ حالات قابو سے باہر اُس وقت ہوئے جب ایک ماں کے سامنے اس کے شوہر اور بیٹے کو مارنے کے بعد اس کی بیٹی کے ساتھ اجتماعی عصمت دَری کی گئی اور وہ بے بس ہو کر دیکھتی رہ گئی اس ماں کی رپورٹ تھی:

> ''میرے شوہر اور بیٹے کو مارنے کے بعد میری بیٹی کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے جو کچھ ہوا وہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ گاڈ ایسا کسی کے ساتھ بھی نہیں کرے۔ میرے شوہر چرچ میں فادر تھے۔ وہ نرم گو اور بے حد شفیق انسان تھے۔ ان کے بازوؤں کو بڑی بے رحمی سے چھریوں سے کاٹا گیا تھا۔''[1]

کچھ دیر ٹھہری اور روتے ہوئے بولی:

''میرے جگر کا ٹکڑا بارہویں جماعت میں
پڑھتا تھا۔ وہ نہایت شریف بچہ تھا۔ کبھی کسی سے
لڑائی جھگڑا بھی نہیں کیا تھا اسے بھی ظالموں نے
ڈنڈوں سے مار مار کر موت کے گھاٹ
اتار دیا۔ میرے بیٹے کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ اپنی
بہن کو بچانے کے لیے ہجوم کے پیچھے بھاگا تھا۔''۲؎

اس طرح کے کئی واقعات رونما ہوئے ہیں۔ جس کو بیان کرتے ہوئے روح کانپتی ہے۔ لیکن واقعہ کو انجام دینے والے واہ رے شقی القلب انسان ذرہ برابر بھی درد کو محسوس نہیں کرتے۔ ایسے ہی ایک اور رپورٹ کے مطابق کہ کوکی خاندان کی عورت ننگنی جورو تے ہوئے رپورٹر کو بیان دی:

''کہ ان کے شوہر انڈین فوج میں تھے اور
صوبے دار کے عہدہ پر فائز تھے۔ وہ بس ہم لوگوں
سے ملنے کے لیے گھر آئے تھے۔ اُس دن وہ پاس
کے ایک چرچ میں عبادت کر رہے تھے کہ باہر
فائرنگ ہوئی اور گولیاں چرچ کے اندر بھی چلنے
لگیں۔ میرے شوہر نے ان لوگوں سے بڑی منت
وسماجت کی تھی۔ ہاتھ اٹھا کر خود کو سرینڈر کیا تھا
اور بتایا تھا کہ وہ ملک کا ایک فوجی ہے اور سب کی
حفاظت کرنے والا ہے۔ لیکن ان ظالموں نے ان
کی ایک نہیں سنی اور گولیوں سے بھون دیا۔''۳؎

کس طرح سیاسی، سماجی اور قبائلی نفرت کا زہر گھول کر لوگوں کو پلایا گیا تھا کہ چرچ کے اندر عبادت میں مشغول فوجی کو بخشا نہیں گیا اور نہ اس کی فریاد سنی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ منی پور جو پہاڑی علاقہ ہے دراصل وہ قدرتی گیس، پٹرولیم اور کوبالٹ جیسے معدنیات کا عظیم سرمایہ ہے۔ اس پہ مکمل طور پر قبضہ کی خواہش اور نظر دونوں سماج کی ہے۔ کوکی قبیلہ والے عیسائی ہیں جب کہ میتئی والے ہندو ہیں۔ اس میں شالوا اور گانگٹے کی محبت کا ذکر بھی ہے جو رومانی فضا کے لیے بہتر ہے۔ شالو میتئی قبیلہ اور ہندو مذہب سے ہے۔ گانگٹے کوکی قبیلہ اور کرسچن ہے۔ دونوں کی محبت اور بعد میں دونوں شادی کرتے ہیں۔ دونوں اس بات کی بھرپور کوشش کرتے ہیں کہ دونوں سماج کے درمیان کسی طرح کی کشیدگی، دشمنی اور بھید بھاؤ نہ رہیہ سب کچھ ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے۔ دونوں شالوا اور پریم گانگٹے اپنا گھر ایسی جگہ تعمیر کیے اور ٹیوشن پڑھانے کا سلسلہ شروع کیے جہاں دونوں قبیلے کے بچے آکر پڑھتے ہیں۔ سبھی لوگ اس طرز تعلیم اور نگانگت سے بہت خوش تھے۔ اتحاد کا درس بھی ملتا تھا اور صدیوں پرانا بھید بھاؤ بھی ختم ہونے لگا تھا۔ نئی نسل کے بچوں کو اس طرح کی آلودگی سے اور نفرت سے نکال کر اتحاد اور اپنے پن کا احساس دلایا جاتا تھا اور ان سب خرابیوں سے ان کو دور رکھنے کی کوشش بھی تھی لیکن آہستہ آہستہ سیاست اور قبائلی فطرت وعادت نے رُخ موڑنا شروع کیا۔ وہی دھارمک، ذات پات، قبیلہ، حب الوطنی وغداری کا الزام ایک دوسرے پر تھوپنے کا سلسلہ شروع ہوا اور اس بار اتنی تیزی سے پھیلنا شروع ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں سماج کے درمیان جو محبت کے پھول کھلے تھے وہ مُرجھانے لگے۔ ان پھولوں سے محبت کی خوشبو پھوٹنے ہی لگی تھی کہ نفرت کی بدبودار ہوا سے ختم ہوگئی۔ پہاڑی وادی میں جو بڑھے، بوڑھے اور امن پسند لوگ رہتے تھے۔ اتحاد واختلاف کے اچھے برے نتائج سے واقف تھے۔ انسانیت اور امن کی پہچان سے آشنا تھے۔ وہ آپس میں اس طرح باتیں کرنے لگے۔

دیکھو! ہر کوکی بُرا نہیں ہے اور ہر میتئی ضروری
نہیں کہ اچھا ہی ہو۔'' ''ہاں یہ تو ہے۔۔۔ لیکن پھر
کیوں ہر کوئی، میتئی کو اور ہر میتئی، کوکی کو بُرا سمجھنے پر
مجبور ہے۔'' ''اصل میں ہر گھر میں ایک دوسرے کے
خلاف زہر اگلنے والی مشین لگائی جارہی ہے۔'' ''تو ایسے
میں کسی کو اتنی فرصت نہیں ہے کہ سچ اور جھوٹ کی
پیمائش کرے۔'' ''مطلب یہی نا..... کہ ہر کوکی
کی نظر میں ''کوکی'' بے گناہ ہے اور ہر میتئی کی نگاہ میں
''میتئی انصاف کا پُتلا ہے۔'' ''یہی تو غلط بات
ہے۔ جب ہم خانے میں بٹ جاتے ہیں اور انسانیت
کی بقا کی جنگ کے بدلے اپنی شناخت کی جنگ
لڑنے لگتے ہیں تو ہم کمزور ہونے لگتے ہیں۔ اور یہی وہ
کمزوری ہے جس کا فائدہ تیسرا اٹھاتا ہے۔''۴؎

''سر میرا ناتی اپنے گھر میں پھنسا ہوا ہے۔ کسی وجہ سے وہ وہاں سے نہیں نکل پایا ہے۔ اور اب دن بہ دن حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں۔ سر ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں پولس کا پروٹکشن دیا جائے تاکہ ہم وہاں جاکر اپنے بچے کو صحیح سلامت گھر لاسکیں۔''

''کیا نام ہے؟''

''دیپو۔''

"باپ کا نام....؟"
''پریم گانگٹے۔''
''کیسے آدمی ہو کہ تم اپنے آپ کو 'میتئی' بتا رہے ہو اور جان ایک 'کوکی' کی بچانے جا رہے ہو۔ ارے بھائی! کہیں کسی میتئی کی جان خطرہ میں ہے تو بتاؤ۔ خواہ مخواہ میرا وقت کیوں برباد کر رہے ہو۔ اعلیٰ افسر نے دوٹوک لفظوں میں کہا۔ ۵؎

سروہ میرا ناتی ہے اور برتھ سرٹیفکیٹ میں ہندو لکھا ہوا ہے۔ یعنی وہ میتئی ذات سے ہے۔ یہ سنتے ہی اعلیٰ افسر نے دیپو کو بچانا فرض سمجھا او ر پروٹیکشن کے لئے پولس کی سروس فراہم کی گئی۔ پولس ٹیم کے ساتھ شالو کے پاپا اور بھائی پریم شالہ منزل پہنچے۔ اس جگہ اعلیٰ افسر کی باتوں اور رویے سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ قبائلی بھید بھاؤ کتنی گہرائی تک ہے۔ کتنی شدت پسندی ہے کہ دوسری ذات کے لوگوں کی جان کی حفاظت غیر ضروری محسوس کرتے ہیں۔ دوسری ذات کی پریشانیوں کو بولنا، سننا اور سنانا فضول باتیں کرنے کے برابر ہے۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں یہ ناول سیاسی، قبائلی بھید بھاؤ اور رومانیت کی جھلک پر مشتمل ہے۔ ویسے بھی رومانیت معیوب نہیں بلکہ دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے معاون ثابت ہوتی ہے۔ قبائلی بھید بھاؤ کی وجہ سے جو قیامت خیز حالات پیدا ہوئے وہ سیاہ تاریخ میں ہمیشہ کے لئے رقم ہو گئے۔ بیانیہ انداز میں وہ قاری کو اپنی گرفت میں رکھتے ہوئے اُس وقت کی حقیت اور لوگوں کی ذہنیت کو اجاگر کئے ہیں۔ بیان کی ہنرمندی ایسی کہ پڑھنے والا خود کو اس ماحول میں محسوس کرتا ہے۔ بھرپور تخلیقی صلاحیت اور تحریر کے ذریعے متعلقہ موضوع پر وہاں کے سیاسی، سماجی او رتہذیبی انفرادیت دکو پیش کئے ہیں۔ انسانی مصائب اور کربناک اذیت اور مختلف اذہان اور حساس لوگوں کی تصویریں پیش کی ہیں۔ اکیسویں صدی کے بہترین ناولوں میں اضافہ ہوا۔

حوالے:

(1) جلتا پہاڑی سیارہ، ڈاکٹر اختر آزاد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2025، ص:30
(2) ایضاً ص 31
(3) ایضاً ص:38
(4) ایضاً ص:126
(5) ایضاً ص:140/141

☆☆☆

غزل

دیر تک کیسے جلیں گے اپنی شہرت کے چراغ
صبح سے پہلے ہی بجھ جاتے ہیں غربت کے چراغ
خودنمائی کرنے والے شان وشوکت کے چراغ
خاک میں مل جائیں گے اِک روز دولت کے چراغ
روشنی کی پرورش میں مدتوں سے قید ہیں
آنکھ کی اندھی گپھا میں یاس وحسرت کے چراغ
نفرتوں کی آندھیاں ان کا مٹا دیں گی وجود
جن کی پلکوں پر نہیں جلتے محبت کے چراغ
پھر اندھیرے اپنی وسعت گر بڑھانا چاہیں گے
سرحدوں پر ہم جلائیں گے شہادت کے چراغ
پھونکنے پر بُجھ گئے ہیں سب چراغِ نو مگر
آندھیوں میں خندہ زن ہیں اب بھی مدت کے چراغ
کیوں مرے نزدیک لاتے ہو وفا کے تذکرے
کون رکھتا ہے سرہانے ایک میت کے چراغ
عزم کو اپنے پنہاؤ پتھروں کے تم لباس
آنسوؤں سے قتل ہو جاتے ہیں ہمت کے چراغ
معتبر ہوگا کہاں دلشاد دل تیرا سُخن
ڈھونڈھتے ہیں شاعری میں سب سلاست کے چراغ

☆☆☆

دلشاد دل سکندر پوری
امبیڈکر نگر، یوپی۔ موبائل:9628507617

ڈاکٹر بدر محمدی کی تبصرہ نگاری

(''بعد از مطالعہ'' کی روشنی میں)

ڈاکٹر ریحان احمد قادری

گورنمنٹ ڈگری کالج، بینی پور، دربھنگہ۔ موبائل: 9031201641

بدر محمدی کا اصل نام بدرالزماں ہے مگر ان کی شہرت اپنے قلمی نام بدر محمدی سے ہے۔ آپ کی پیدائش ۲ رنومبر ۱۹۶۳ء کو ریاض علی کے گھر چاند پور فتح، ویشالی، بہار کی سرزمین پر ہوئی۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد (ایم۔اے۔ اردو اور فارسی) زبانوں میں کیا اور ابھی درس وتدریس کے کام میں منہمک ہیں۔ آپ ایک اچھے معلم، شاعر، بہترین صحافی، تنقید نگار اور عمدہ تبصرہ نگار کے طور پر مشہور ہیں، یہی وجہ ہے کہ ادب کی دنیا میں ان کا نام نمایاں ہے۔ اس شہرت کی ایک اہم وجہ آپ کی اردو زبان سے محبت اور ادب کی خدمت ہے۔ اگر بات ان کے کتابوں کی، کی جائے تو سال ۲۰۱۱ء میں مجموعۂ غزل (۱) ''بنت فنون کا رشتہ'' آئی پھر سال ۲۰۱۰ء میں (۲) ''امعان نظر'' (تبصرے) ۲۰۱۰ء کی کتاب آئی، مجموعۂ غزل۔ ۲۰۱۷ء (۳) خوشبو کے حوالے) آئی۔ چوتھی کتاب ''ہمعصر شعری جہات'' (تنقیدی مضامین) ۲۰۲۱ء، پانچویں کتاب ''بنت فنون کا رشتہ'' مع تبصرہ وتجزیہ۔ ۲۰۲۲ء اور چھٹی کتاب ''بعد از مطالعہ'' (تبصرے) ۲۰۲۴ء میں منظر عام پر آئی۔ کتاب میں کل ستائیس (۲۷) مضامین ہیں، ان مضامین پر ڈاکٹر بدر محمدی نے اپنے تاثرات کا اظہار خیال کیا ہے۔ زبان ادب میں تبصرے کی اپنی اہمیت ہے۔ پروفیسر مجید بیدار کے مطابق:

> ''عربی زبان کے لفظ ''بصر'' سے وجود میں آنے والی ترکیب ''تبصرہ'' کا استعمال تصریح وتفصیل اور توضیح کے لئے ہوتا ہے۔ ہر چیز کے مشاہدہ کے بعد انسان کی غور وفکر سے وجود میں آنے والے تمام خیالات جو اس چیز سے متعلق ہوں انہیں بیان کرنا تبصرہ کا درجہ رکھتا ہے۔ اردو نثر میں کسی کتاب، رسالہ یا کسی بھی وجود کو دیکھنے کے بعد ان کے محاسن ومعائب کے اظہار کو تبصرہ نویسی کا درجہ دیا گیا ہے۔ اردو ادب میں اسے ایک مصنف کی حیثیت حاصل ہے۔''

(حوالہ اردو کی شعری ونثری اصناف۔ ص: ۲۵۶)

کتاب کے حوالہ سے ایم۔ نصر اللہ نصر یوں لکھتے ہیں:

> ''بدر محمدی کے تبصروں میں بہت جان ہے۔ لطف ونشاط بھی، علم وآگہی کی روانی وفراوانی بھی۔ اس کتاب کے مطالعے سے جہاں قاری ادبی نکات سے حظ اٹھا سکتا ہے اور اہم موضوعات سے استفادہ کر سکتا ہے وہیں تبصرے کے ہنر سے آشنا ہو سکتا ہے۔ زبان وبیان اور جملے تراشنے کا ہنر سیکھ سکتا ہے۔ بات کرنے کا سلیقہ آ سکتا ہے۔ اپنی تحریر کو لائق تحسین کیسے بنائیں، اس کے گُر سے آشنا ہو سکتا ہے۔ اس کتاب میں جہاں بدر صاحب نے صاحبان کتب کی شعری وادبی شخصیات کی شناخت کرائی ہے وہیں اپنی نثری استعداد کا بھی خوب مظاہرہ کیا ہے۔''

تبصرے کی ضرورت اور اہمیت پر فاضل مبصر نے مصنف کو یہ مشورہ دیا ہے کہ کوئی تخلیق لکھتے وقت وہ ہمیشہ اپنی اہلیت اور کتاب کے نفسی مضمون کے مابین مماثلت اور ہم آہنگی کو ضرور نظر میں رکھیں۔ کتاب میں ایک اقتباس کوثر مظہری کا قابل توجہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اگر تبصروں کی اہمیت فوری طور پر پڑھے جانے تک محدود ہوتی تو آج نہ ظ انصاری کی کتاب پڑھی جاتی نہ پروفیسر شمس الرحمان فاروقی کے تبصرے، نہ آل احمد سرور کے تبصرے لائق مطالعہ ہوتے''۔

علیم صبا نویدی ''بدر محمدی کا فکری آہنگ :بعد از مطالعہ'' کے تحت یوں بیان کرتے ہیں:

''موصوف درس و تدریس کے معزز پیشے سے وابستہ رہے ہیں۔ تعلیمی مشغولات کے ساتھ خود کو ہر وقت ادبی سرگرمیوں میں منہمک رکھتے ہیں۔انہوں نے غزلوں کے دو مجموعے ''بنت فنون کا رشتہ'' اور ''خوشبو کے حوالے'' اور مختلف رسالوں کے خصوصی شماروں پر تبصروں کا مجموعہ ''امعان نظر'' اور تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ ''ہم عصر شعری جہات'' اردو ادب کو دیا اور ارباب علم وفن سے خراج حاصل کیا۔ ''بعد از مطالعہ'' ڈاکٹر بدر محمدی کے مختلف کتابوں پر کئے گئے تبصروں کا مجموعہ ہے۔اس کتاب میں بدر صاحب نے کئی ارباب علم وفن کے مضامین اور شاعری کا نہایت باریک بینی سے مطالعہ اور دلچسپ انداز میں ان کا تجزیہ کیا ہے۔''

اب بات کتاب کی بھی کرتے چلیں تو اس کتاب میں سب سے عمدہ مضمون ''سوئے حرا'' کے نام سے لکھی کتاب پر تبصرہ ہے جو نعت پاک کا مجموعہ ہے جو حمد، مناجات اور نعت کہنے کی سعادت حاصل کرنے والے شاعر فیض احمد شعلہ کی تخلیق ہے۔ اس سے قبل ان کی غزل کا مجموعہ بھی منظر عام پر آچکا ہے۔مگر یہاں ''سوئے حرا'' پر بدر محمدی نے تبصرہ کیا ہے جہاں اس انداز میں حمد کے شعر نمایاں ہوئے ہیں وہ اشعار ملاحظہ ہو:

حکم ہے تیرے ہیں یہ خاموشیاں
رونق بزم سخن تری عطا
مدحت نور مجسم کی مجھے خو دیدے
میرے تخیل کو حسان کی خوشبو دیدے

فیض احمد شعلہ نے رحمت العالمین ، افضل الخلائق، مصطفی رسول، آقا، درود، دھوپ، شاخ، سمت جیسی ردیفیں میں عمدہ نباہ کیا ہے۔ جناب شعلہ نے نبی آخر کی آنکھیں، نعلین اور پسینے کی تعریف بھی کی ہے۔ دو شعر حاضر خدمت ہے:

بھاتا نہیں اس دل کو کوئی مشک نہ عنبر
جس دل میں نہیں ہو ترے نعلین کی خوشبو

☆☆

اے چمن! تجھ کو مبارک ہو گلوں کی خوشبو
میں چلا اپنے شہہ دیں کے پسینے کی طرف

کتاب کے صفحات پر آگے مضمون انوار صابری (پروفیسر زبیر احمد قمر)، تحفۂ پاکیزہ (صبا نقوی)، احساس وادراک (پروفیسر فاروق احمد صدیقی)، مشاہیر کے خطوط کے حوالے سے (ڈاکٹر رؤف خیر) با زوید اور تبصرے (پروفیسر کوثر مظہری) رشحات قلم از فکر انوار الحسن وسطوی، فکر تونسوی: حیات وخدمات (ڈاکٹر ممتاز فرخ)، ''صد برگ کا باب اولیں'' (سید مصباح الدین، احمد کیف عظیم آبادی) مقام اور کلام (ڈاکٹر زرنگار یاسمین) کے نام سے لکھا گیا ہے۔ یہ تمام مضامین کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ان میں ایک مضمون پروفیسر کوثر مظہری کی کتاب ''بازدید اور تبصرے'' کے عنوان سے شائع ہے۔ جس میں ڈاکٹر بدر محمدی ان کی کتاب کے تحت لکھے تبصرے میں رقم کرتے ہیں:

''بازدید اور تبصرے'' کوثر مظہری کی وہ کتاب ہے جس میں نئی اور پرانی کتابوں کا تعارف وتجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ جن نئی کتابوں پر تبصرے لکھے گئے ہیں وہ اس وقت کی بالکل نئی کتاب نہیں لیکن پرانی کتابیں بہت پرانی نہیں۔ پرانے مضامین یا کتابوں کے تجزیاتی مطالعہ کو مطالعہ کر کے کوثر مظہری نے بازدید میں جگہ دی ہے۔ جبکہ نئے یا نسبتاً کم پرانے مضامین یا کتابوں کے تعارف و تجزیہ، تبصرہ یا طویل تبصرہ کو تبصرے کے خانے میں رکھا ہے۔ ''بازدید اور تبصرے'' میں فرق واضح کرتے ہوئے کوثر مظہری نے لکھا ہے کہ بازدید کا تعلق سرسری مطالعے سے نہیں بلکہ حرف بہ حرف اوراق گردانی سے ہے۔ بازدید سے کتاب یا مضمون کا لب لباب سامنے آجاتا ہے۔ انہوں نے

مزید تحریر کیا ہے کہ بازدید سے یہ بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ کسی مضمون یا کتاب کی اہمیت ومعنویت ایک زمانے کے بعد کسی خاص عہد میں کیا رہ جاتی ہے''۔

ان تحریروں کے بعد کے مضامین صریراز ڈاکٹر عبدالقادر اور احقر عزیزی، فاصلوں کا سمندر از علی کاظم، انبساط از نذر فاطمی، اڑان سے آگے از ثناء اللہ ثنا دوگھروی، کشت دل از رضوان علی نقوی، لہولہو ہے قدم از ڈاکٹر منور راہی، وہ جو کیا امر محال تھا ازم۔ اشرف، عکس ٹوٹے آئینے کا از بشر رحیمی، صدائے بسمل از پریم ناتھ بسمل، اردو شاعری میں جانور از ممتاز بدری، جان غزل از مشتاق در بھنگوی، عندلیبان غزل از ظفر حبیبی، شعرائے سمستی پور از ڈاکٹر بسمل عارفی، اشفاق قلق، نغمات حنا، اظہر نیر، ظفر حسین انصاری، نازیہ ترنم کے داؤد وحسن، زبان خلق کے آئینے میں از ڈاکٹر عارف حسن وسطوی، فکر وتحقیق کا افسانہ نمبر۔ این سی پی یو ایل، دہلی اور مجلہ تحقیقات کا شمارہ نمبر ۳، ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ وغیرہ شامل ہے۔ ان مضامین کی فہرست اڑان سے آگے۔ ثناء اللہ ثنا دوگھروی کی کتاب پر ڈاکٹر بدر محمدی یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''ثناء اللہ دوگھروی کے شعری سفر کا پہلا پڑاؤ ہے۔ مجموعہ کے عنوان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی متحرک اور فعال شاعر کا شعری گلدستہ ہے۔ اس میں شاعر کے پرندہ نما افکار و خیالات اور تجربات و مشاہدات پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ یہی شاعری کی اڑان ہے۔ اس کی اڑان حوصلوں کی اڑان ہے۔ اس کی تمنا کا پہلا قدم ہی اڑان سے آگے ہے تو دوسرا کیا ہوگا؟ خدا کرے کہ دشت امکاں اس کے لیے ایک نقش پا ثابت ہو۔ میں دعا اس لیے دے رہا ہوں کہ شاعر نے شعری اڑان کا آغاز خدا کی حمد وثنا سے کیا ہے۔ اس نے خالق ارض وسماں، مالک کون ومکاں اور قادر مطلق کی مدح سرائی کی ہے جس کی تسبیح میں ذرہ ذرہ رطب اللسان ہے۔''

کتاب کے حوالہ سے ایک جگہ مصنف یوں لکھتے ہیں:

''کسی شعری مجموعے کی تعریف کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ یہ مجموعہ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے عمدہ ہے۔ شاعر حسن تدبیر کی تقدیر کی ضیا چاہتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں کی لکیریں دیکھنے والا ہے۔ نشیمن پر نشیمن تعمیر کرنے والا ہے۔ شاعر کا وہ جوش، عزم اور ولولے کو ان کے ان اشعار سے ملاحظہ فرمائیں:

حوصلوں کی اڑان سے آگے
آچلیں آسمان سے آگے

بس چراغوں نے دکھایا تو ذرا سا حوصلہ
آندھیوں کو رحمت حق نے نگہبان کردیا

عزم کا مرے چراغ آج بھی روشن ہے ثناؔ
ورنہ کب سے یہ بجھانے کو ہوا چاہتی ہے

اس کتاب میں ایک مضمون ڈاکٹر منور عالم راہی کی کتاب ''لہولہو ہے قدم'' کے نام سے ہے۔ یہ ڈاکٹر منور راہی کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اس میں ۱۳۰ غزلیں شامل ہیں۔ حمد، نعت پاک، نظم، قطعات اور غزلیں ہیں۔ اس طرح ان کا یہ شعری مجموعہ ''لہولہو ہے قدم'' دو درجن کی تخلیقات پر محیط ہے۔ ڈاکٹر بدر محمدی ان کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

''شعری گلدستہ بنیادی طور پر مجموعہ غزل پر محیط ہے لیکن شاعر نے اس میں نظم اور قطعات شامل کرکے مبصر کے لیے مشکل پیدا کردی ہے۔ شاعر مصور بھی ہوتا ہے اور مجسمہ ساز بھی۔ وہ لفظوں سے بت بھی بناتا ہے اور تصویر بھی۔ ''لہولہو ہے قدم'' میں اتنی ساری لفظی تصاویر ہیں کہ ڈاکٹر منور راہی کے مصور ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ شاعر نے ''لہولہو ہے قدم'' کی جو تصاویر پیش کی ہیں ان میں غم دوراں بھی ہے اور غم جاناں بھی، حتی کہ غم دوراں کا ذکر ضمنی ہے۔ اصل پیش کش غم جاناں کی ہے اور غزل کی شاعری اپنی پیشکش سے منسوب ہے۔''

آگے شاعر نے طرحی غزلیں کہی ہیں۔ ان کی اختراع کی گئی بحر کم کم ہے۔ ایسا منور راہی نے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کیا ہے۔ ان طرحی غزلوں کو راہیؔ نے گرہ خوب لگائی ہے وہ تضمین کے دو اشعار پیش خدمت ہیں:

ہے سوگوار کلی پھول بھی اداس بہت
''چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے''
سلجھا رہا ہوں بیٹھ کر گتھی حیات کی
''کہہ دو یہ موت سے ابھی فرصت نہیں مجھے''

ڈاکٹر بدر محمدی نے ان کے بارے میں ایک جگہ اس انداز میں تحریر کرتے ہیں۔ وہ اقتباس دیکھئے:

''ڈاکٹر محمد منور عالم کا تخلص راہی ہے اور قلمی نام منور راہی، بعض غزلوں کے مقطعے میں منور راہی نے اپنے تخلص کے ہنرمدانہ استعمال سے دوہری معنویت پیدا کی ہے۔ مقطع غزل کا لازمی حصہ ہے۔ مطلع یا بیت کی طرح۔ غرض کہ منور راہی نے اپنے تخلص سے نہ صرف مقطع بلکہ پوری غزل کو متاثر کیا''۔ مثلاً

ہم پیار کے ہیں راہی رہزن تو محبت کا
ہم آنکھ بچھائیں گے تم خار بچھاؤ گے
گن لے راہی اور تو دو چار پتھر میل کے
حسرت منزل مجھے یہ کہہ کے بہلانے لگی

گو کہ کتاب میں شامل مضامین کی اپنی اہمیت آپ ہے۔ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ میرا مقالہ زیادہ طویل نہ ہو اس سبب سے میں نے دیگر لوگوں پر اپنی تحریر پیش نہیں کیا ہے۔ آخر میں کتاب بعد از مطالعہ میں ماہر ادبیات ڈاکٹر بدر محمدی کے تعلق سے جو کچھ رقم کیا ہے اس تحریر کو پیش کر ہی اپنی بات کو ختم کرتا ہوں جو ڈاکٹر ابرار رحمانی سابق مدیر آج کل کچھ یوں لکھتے ہیں:

''بعد از مطالعہ'' ان کی ایک ایسی ہی اہم کتاب ہے۔ اگر اس میں تنقید کی ذرا سی اور چاشنی ڈال دی جائے تو یہ ایک مکمل و مجسم چیز ہو جاتی ہے جسے ہم تبصرہ واقعی کہہ سکتے۔ بدر محمدی بہار کے ویشالی ضلع میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہنے والے ہیں لیکن وہ جو کچھ پڑھتے اور لکھتے ہیں ان کا حق ادا کر دیتے ہیں۔'' بس ایک شعر حاضر خدمت کرتا ہوں:

متفق اس بات سے ہیں اہل ذوق
سب سے بہتر ہے کتب بینی کا شوق

اور کتاب کے پشت پر پروفیسر محمد محفوظ الحسن سابق صدر شعبہ اردو، بودھ گیا، یوں رقم کرتے ہیں:

''بدر محمدی اردو ادب کے موجودہ منظرنامے کا ایک اہم نام ہے۔ اپنی محنت اور وسعت مطالعہ اور بے باکانہ، ایماندارانہ انداز بیان سے انہوں نے اپنی شناخت خود بنائی ہے۔ اپنی شہرت کے لئے کسی بیساکھی کا استعمال کیا گیا ہے۔ وہ اپنے پیروں پر خود کھڑے ہیں۔ اس لیے امید کی جانی چاہئے کہ دیر تک کھڑے رہیں گے اور دور تک جانے پہچانے جائیں گے۔''

وہ مزید آگے لکھتے ہیں کہ:

''میری بدر محمدی سے کوئی ذاتی ملاقات نہیں مگر انہیں میں ان کی تحریروں کے حوالہ سے جانتا ہوں، رسائل، اخبارات میں ان کے رشحات قلم سے مستفید ہوتا رہتا ہوں۔ ''بعد از مطالعہ'' ان کے تبصروں کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ تبصرہ کسے کہتے ہیں؟ اس کی ضروریات کیا ہیں؟ اس کے تقاضے اور حدود کیا ہیں؟ فن تبصرہ نگاری اور فن تنقید نگاری میں مماثلت، مغائرت سے وہ باخبر ہیں۔ اپنے مطالعہ کی بنیاد پر میں بدر محمدی کو ان تبصرہ نگاروں کی صف میں رکھتا ہوں، جو کتابوں کے مطالعہ الف سے ی تک کرتے ہیں۔ ان کے تبصروں میں سب کچھ ہے جس کی ایک مبصر سے امید کیا جا سکتی ہے۔ زیر گفتگو تبصروں میں دیانت دارانہ مطالعہ، غیر جانبدارانہ، بے باک و بے لاگ رائے ہے، تعریف، توصیف و تحسین کے ڈونگرے نہیں اور نہ ہی بے جا تنقیص و تنقید۔ خوبیوں کو سراہا گیا ہے، خامیوں کی جانب نشاندہی اور اشارہ کیا گیا ہے۔

بدر محمدی کے تبصرے پڑھنے کے بعد ان کتابوں سے ملاقات کو جی مچلنے لگتا ہے جن پر انہوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ ان تبصروں میں بڑے ناموں سے مرعوبیت اور چھوٹے ناموں پر دھونس جمانے کی کیفیت نہیں ملتی ہے۔ بڑے ناموں کی فرد گذاشتوں پر بے جھجک انگلی رکھی گئی ہے اور نو آموز ان ادب کی رہنمائی کا جذبہ دکھایا گیا ہے۔ ان تبصروں کی زبان رواں دواں، شگفتہ اور سلیس ہے۔''

میں اپنی بات شیخ ابراہیم ذوق کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں:

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو
زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

☆☆☆

غزل

فانی ہر اک جمال ہے آخر
یہی مجھ کو ملال ہے آخر

کس لئے اتنا کھوئے جاتے ہو
یعنی اس کا خیال ہے آخر

آخرش وہ نہیں ملا مجھ کو
زندگی پائمال ہے آخر

مستقل مجھ کو دیکھتے کیوں ہو
کتنا بھولا سوال ہے آخر

مدتوں بعد وہ نظر آیا
چین پھر سے بحال ہے آخر

اپنا عاشق بنا دیا سب کو
یہی اُس میں کمال ہے آخر

ظلم پہ اس قدر نہ ہو مسرور
سب کا اک دن زوال ہے آخر

☆☆☆

مقصود خاں علیگ
نئی دہلی۔موبائل: 8595687815

غزل

پھول شکووں کے سجائے نہ شکایت کی ہے
ہم نے ہر دور میں تعظیم محبت کی ہے

ہے کہیں کوئی وفادار ہمارے جیسا
جس نے خون دے کے ادا عشق کی قیمت کی ہے

در سے سائل کو جو لوٹا دیا خالی اس نے
اپنے دستور و روایت سے بغاوت کی ہے

اس نے پھر اج محبت کے ورق الٹے ہیں
مدتوں بعد میرے خط کی زیارت کی ہے

کب مدد مانگی زمانے کی طرفداروں سے
اپنے کردار کی خود ہم نے حفاظت کی ہے

ہم سے زہریلی ہواؤں نے پناہیں مانگیں
اپنے ماں باپ کی جس روز سے خدمت کی ہے

جب بھی تنہائی میں گھبرایا ہے یہ دل مدہوشؔ
ہم نے قرآن کے پاروں کی تلاوت کی ہے

☆☆☆

مدہوش بلگرامی
موبائل:9696778136

''پسِ دیوارِ خواب''

ہوئی صبح
رنگوں کی پریاں اترنے لگیں
در و بام پر نقشِ رنگیں بنائے
تناور درختوں پہ بیٹھے
طیورِ فسردہ کی خوشیوں کا باعث ہوئیں
شفق رنگ، گل پوش وادی میں
معصوم چڑیوں کی چہکار گونجی
وہ خوش رنگ پریاں
خرامِ سبک پا
ہم رقص پھولوں کی ہو کر
شاخ در شاخ غنچوں سے اتریں
گہرے خاموش تالاب میں غسل کرنے لگیں
سارا تالاب رنگین ہوا
ٹھنڈی سانسیں جو بھرتے تھے برفاب وہ
ایک رنگین بوسے کی حدّت سے چونکے
مہکتی ہوئی وادیاں
نرم سیّال سونے سے روشن ہوئیں
چٹانوں کے ہاتھوں سے شیشے گرے
اَنار یزہ ریزہ ہوئی
فضا میں تقدّس کی چادر تنی تھی

ہوا میں عبادت کی خوشبو رچی تھی
مگر سارا منظر تھا بس ایک لمحہ
تقدس کی چادر پہ تاریک دھبے ابھرنے لگے
فضا سسکیوں اور چیخوں سے گونجی
یہ کس سحر میں سب گرفتار ہیں
سبھی جیسے پتھر کی مورت بنے ہیں
ہر اِک ہاتھ میں ان کا زادِ سفر
ٹوٹے ہوئے خواب کا آئینہ ہے

''عداوت''

اس نے اب انگارے کھائے
اس کا چہرہ لال بھبھوکا
آنکھوں میں سورج چمکا
رگ رگ ہو گئیں آگ کی نہریں
کس نے اس کو بھڑکایا
تڑ تڑ، چٹاخ چٹاخ
دیواروں پر خون کی چھینٹیں
سایوں سے لڑتے لڑتے
اپنی آگ میں جلتے جلتے
آخر کو وہ بھسم ہوا

شعیب ندیم گورکھپوری۔ موبائل: 8565876007

اس شب بھی آرام نہیں

ہے بھیگی ہتھیلی کاغذ کی کچھ بھیگے سے جذبات لیے
الفاظ کے کرچیں بے معانی احساس مگر لبریز یہاں

یہ شام بہت دن بعد ملی جب غم کو دل نے چھیڑ دیا
اک خواب کے میلے دامن سے لپٹی ہیں صدائے آج یہاں

پھر روٹھے شب کی پرچھائی نے آکے مجھ کو گھیر لیا
کیوں ماضی کا اک گیت ابھی آکے ٹھہرا اِن ہونٹوں پر

وہ گیت پگھل کے کاغذ پہ اک نقش اُبھارا یادوں کا
پھر اشکوں نے لی انگڑائی اور بہ نکلے اِن آنکھوں سے

جو درد مرے دل میں اُترا وہ درد پرانا تھا لیکن
ہر بار نئی اک صورت ہے ہر بار نیا سا ویرانہ

اِس ویرانے میں غم اکثر اک سایہ بن کے رہتا ہے
یا میں ہی اُس کا سایہ ہوں اور دل ہے میرا غم خانہ

کچھ اور تلاشی یادوں کی کچھ اور فضا کی مایوسی
کس اور چلی ہے رات یہاں کس اور سحر کا افسانہ

ہیں خواب تراشا اِس دل میں ہے رات کی چادر آنکھوں پر
اے چاند افسردہ گیت سُنو بیچین ابھی ہے دوانہ

☆☆☆

سُشانت چٹوپادھیائے سفیرؔ،
پریاگ راج، اتر پردیش۔ موبائل:8127487120

نذرِ غالب

محرومیوں سے تاب و تپِ بال و پر گئی
پرواز کی تڑپ مجھے پھر زندہ کر گئی

وہ سنگ ریزہ ٹھوکریں اس کا نصیب تھیں
جوہر شناسوں کی بھی نہ اُس پر نظر گئی

سب تھے خدائے وقت لیے اک مرے سوا
یوں آزمائشوں کی گھڑی سے گزر گئی

بھر بھر کے جام سب کو پلائے گئے مگر
تشنہ بلب بھی کوئی تھا کس کی نظر گئی

عزمِ حسینی دے خدا اس رزم گاہ میں
اب کے تو ٹوٹی ایسی کہ بالکل بکھر گئی

وہ لذتِ نجات کا عالم وہ چشمِ تر
"تکلیف ِپردہ داری ِزخمِ جگر گئی"

☆☆☆

ڈاکٹر نفیس بانو
سابق صدر شعبۂ اردو، وسنت کالج وارانسی، بنارس ہندو یونیورسٹی
موبائل:6390850063

'وفا'

انسان کو انسان بناتی ہے وفا
جینے کا ہنر سکھاتی ہے وفا
عمر بھر ساتھ نبھانا سکھاتی ہے وفا
رشتوں کو تھامے رکھنے کا سلیقہ سکھاتی ہے وفا!
کسی کا ہاتھ یوں تھامنا کہ عمر بھر نہ چھوڑنا
کیا یہی ہے وفا؟
ہاں یہی ہے وفا
یہ دورِ حاضر کے لوگ کیا جانے
کہ کیا ہوتی ہے وفا
وہ شیریں و فرہاد لیلیٰ و مجنوں تھی جن میں وفا
جان سے ہو گئے جگر خالی
نہ کی پھر بھی بے وفائی
دل ہوا ہے گویا ان کا
سرائے خانہ
دعویٰ کرتے ہیں محبت کا
چیخ چیخ کر
شکر خدا کا جس نے تیرے جیسا دوست عطا فرمایا

☆☆☆

سنبل فاطمہ
لکھنؤ، موبائل: 9336844469

ہلالِ عید

ہلالِ عید جب اُس کو دِکھایا ہوگا سکھیوں نے
نیازؔ اِک پل کو اُسکے دِل کی دھڑکن رُک گئی ہوگی
مری تصویر دِل کے آئینے میں دیکھ لینے کو
وہ تڑپی ہوگی اُس کی چشمِ پُرنَم جُھک گئی ہوگی

بدن بے جاں ہُوا ہوگا، قدم بوجھل ہُوئے ہونگے
یا اُسکے پاؤں پائل میں اُلجھ کر رہ گئے ہونگے
چھُپا کر چہرۂ گُل رنگ کو دستِ حنائی سے
وہ روئی ہوگی اور آنکھوں سے کاجل بہہ گئے ہونگے

مری تصویر سینے سے لگا کر مُوند کر آنکھیں
مجھے وہ سوچ کے آنگن میں پیہم ڈھونڈتی ہوگی
گلے مِلنے کی حسرت میں سُلگتا ہوگا مَن اُسکا
وہ میرے قُرب کی بارِش کا موسم ڈھونڈتی ہوگی

اُداسی گرد بَن کر اُسکے چہرے پر جمی ہوگی
سبھی کے چہروں پر رقصاں مسرّت عید کی ہوگی
نیازؔ احساس یہ مجھکو بھی شعلوں میں جلاتا ہے
کہ اُسکی سُونی آنکھوں میں تمنّا دید کی ہوگی

☆☆☆

نیازؔ جیراجپوری
(جالندھری، اعظم گڑھ۔ موبائل:9452505605)

ڈائمنڈ رنگ

وسیم احمد صدیقی
میل بورن، اسٹریلیا

آج اس کی شادی کی سالگرہ تھی ہمیشہ کی طرح اس کی بیوی نے اس سے ڈائمنڈ رنگ کی فرمائش کی۔ کاش وہ کبھی اپنی بیوی کی یہ فرمائش پوری کرسکتا۔ وہ صبح سے یہی سوچ رہا تھا کتنی معصوم ہے اس کی بیوی۔ اس کو کتنی تنخواہ ملتی ہے، اس کی بیوی کو نہیں پتہ اور نہ ہی کبھی اس نے جاننا چاہا حالانکہ اتنی تنخواہ ضرور تھی کی گھر کا خرچ آسانی سے چل رہا تھا اور وہ اس کے لیے چھوٹے موٹے تحفے بھی لا دیا کرتا تھا لیکن اس میں ڈائمنڈ رنگ کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ اس نے سوچا اس کی بیوی کی ڈائمنڈ رنگ کی فرمائش بے جا نہیں ہے وہ اتنی بھولی بھالی ہے کہ اسے ڈائمنڈ رنگ کی قیمت کا اندازہ ہی نہیں ہوگا وہ ایک رومانٹک قسم کی لڑکی تھی۔ قصہ کہانیوں میں ڈائمنڈ رنگ کے بارے میں پڑھ رکھا تھا۔ بادشاہ، شہزادے، فلمی ہیرو سب ہی اپنی بیوی یا محبوباؤں کو ڈائمنڈ رنگ کے تحفہ دیتے رہتے ہیں۔ وہ ان کسی بھی کٹیگری میں نہیں آتا ہے۔ لیکن تب بھی اس کی بیوی کو اس سے ڈائمنڈ رنگ کی توقع تھی۔ وہ ارشد خان کے بارے میں سوچنے لگا ابھی پچھلے ہفتے وہ دبئی سے آیا تھا اور اپنی بیوی کے لیے ہیرے کی انگوٹھی لایا تھا۔ بڑے بڑے نگوں والی جس کو اس کی بیوی اترا اترا کر پورے کالونی میں دکھا رہی تھی۔ پتہ نہیں ارشد خان کتنا کماتا ہے۔ لاکھوں کی انگوٹھی ہوگی وہ ارشد خان کی لائی ہوئی انگوٹھی کے بارے میں سوچتا رہا۔

آج انیورسری میں اس نے اپنی بیوی کو ایک امپورٹڈ لپسٹک دی اور باہر ڈنر پر لے گیا اور اس کو جلدی ہی ہیرے کی انگوٹھی دلانے کا پکا وعدہ بھی کیا۔ وہ ارشد خاں کی سے انگوٹھی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ ارشد خان نے اسے بتایا اس طرح کی اصلی ڈائمنڈ رنگ دس لاکھ روپے سے کم نہیں ہوگی یہ تو دس ہزار روپے کی ہے۔ کیا مطلب وہ انگوٹھی اصلی نہیں ہے۔ یار تم بھی عجیب آدمی ہو میرے بارے میں جانتے ہو میری ذمہ داریاں تم کو پتہ ہے میں دس لاکھ روپے کی انگوٹھی خریدوں گا۔ یہ انگوٹھی ڈائمنڈ کی نقل ہے۔ آرٹیفیسیل دیکھنے میں بالکل ڈائمنڈ کی طرح لگتی ہے اتنی زیادہ اصلی ڈائمنڈ سے ملتی ہے کہ اچھے اچھے جوہری بھی پہلی نظر میں دھوکہ کھا جائیں۔ اس نے ارشد خاں سے وعدہ لے لیا کہ اب کی جب وہ دبئی سے آئے تو ایسی ہی آرٹیفیسل ڈائمنڈ رنگ اس کے لیے لے آئے اور اس نے ارشد خان کو دس ہزار روپیہ بھی پکڑا دیے۔

اب کی شادی کی سالگرہ میں اس نے اپنی بیوی کو ایک بہت خوبصورت چمچماتی جھلملاتی ڈائمنڈ رنگ پیش کر دی۔ بعض آرٹیفیشل چیزیں۔ اوریجنل سے زیادہ خوبصورت لگتی ہیں۔ انگوٹھی کی چمک سے اس کی بیوی کا چہرہ دمک اٹھا۔ آج وہ صبح سو کر اٹھا تو اس کے سر میں شدید درد تھا۔ ویسے تو اس کے سر میں درد رہتا تھا لیکن آج درد کچھ اتنا شدید تھا کہ اسے ہاسپٹل جانا پڑا۔ وہاں اس کا سٹی اسکین ہوا تو پتہ چلا برین ٹیومر ہے۔ برین اسپیشلٹ کو دکھایا تو اس نے بتایا آپریشن ضروری ہے۔ فوراً ایڈمٹ ہوجانے کو کہا۔ پانچ لاکھ روپے کا خرچہ ہے آپریشن وغیرہ کا۔ اس نے بیوی اس نے اپنی بیوی سے کہا چلو گھر واپس چلتے ہیں یہ سب رپورٹ غلط ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ظاہر ہے اس کے پاس پانچ لاکھ روپے کہاں تھے ڈاکٹر کو دینے کے لیے۔ نہیں ایسے نہیں چلتے تم ایڈمٹ ہوجاؤ اس کی بیوی کسی طرح گھر واپس جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ آخر اس کو کہنا ہی پڑا ابھی وہ پانچ لاکھ روپے کا انتظام نہیں کرسکتا لیکن جلد ہی کرلے گا پھر ایڈمٹ ہوجائے گا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ گھر واپس آ گیا۔ ڈاکٹر نے چلتے چلتے اسے ہدایتیں دی تھیں کہ وہ جلد سے جلد ہسپتال واپس آ کر آپریشن کرالے یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ آج کھانا کھاتے ہوئے وہ اچانک کرسی پر لڑک کر گر گیا۔ وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔ اس کی بیوی گھبرا گئی اس نے پڑوس کی فلیٹ کا دروازہ پیٹ پیٹ کر رکھ دیا وہاں کسی یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹ رہتے تھے۔ وہ سب ہی آ گئے کسی گاڑی کا انتظام ہوا۔ وہ سب اسے لے کر ہاسپٹل پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے کہا ابھی فوراً اپریشن کرنا پڑے گا۔ آپ فیس ریسیپشن پر جمع کرادیں۔ اس کی بیوی نے کہا اس وقت میرے پاس صرف یہی ہیرے کی انگوٹھی ہے پھر اس نے انگوٹھی اتار کر ڈاکٹر کی میز پر رکھ دی۔ کھڑکی سے دھوپ اندر آ رہی تھی وہ اس انگوٹھی کے نگینوں پر پڑی تو وہ انگوٹھی اور جھلملا اٹھی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر کی آنکھیں بھی چمکنے لگی تھیں۔ اس نے انگوٹھی اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لی تھی۔ اس کے شوہر کا آپریشن ہوگیا تھا۔ بہت کامیاب۔

☆☆☆

حق تلفی

ڈاکٹر سلیم احمد
ایڈیٹر: ادبی نشیمن۔لکھنؤ، موبائل: 9415693119

عرفان میاں کو نوکری سے سبکدوش ہوئے ایک برس ہو گئے تھے فنڈ کا جو پیسہ ملا تھا اس سے گھر کی تزئین کاری کرائی اور حج بیت اللہ کے لیے فارم بھر دیا۔قسمت اچھی تھی کہ پہلی ہی بار کے قرعہ اندازی میں ان کا نام آ گیا۔

حج سے واپسی کے بعد اب عرفان میاں حاجی صاحب کے نام سے لوگوں میں مقبول عام ہو گئے۔مقبولیت بھی اتنی ہوئی کہ لوگ اپنے مسئلے مسائل کے نپٹارے حاجی صاحب سے کراتے اور حاجی صاحب جو فیصلہ سناتے سب مانتے۔

ایسا ہی ایک معاملہ وراثت کا پیش آیا۔معاملہ بھائی بہنوں میں جائداد کے بٹوارے کا تھا۔حاجی صاحب نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا دیکھئے !شرعاً والدین کے ترکہ میں بیٹوں کی طرح بیٹیوں کا بھی حق وحصہ ہوتا ہے۔اس لیے والدین کی جائداد میں سے بیٹیوں کو ان کا حق نہ دینا ان کی حق تلفی ہوگی اور اس کے لیے آخرت میں سخت عذاب ہے۔

حاجی صاحب کی اس بات سے سب متفق ہوئے اور اپنی بہنوں کو ان کا حصہ دے دیا۔

رمضان کا مبارک مہینہ شروع ہو چکا تھا۔بازار کی رونق بڑھنے لگی تھیں۔طرح طرح کے سامانوں سے سجی ہوئی دکانیں،سوکا مال پچاس میں، پچاس کا سامان صرف بیس روپئے میں، ہر مال دس روپے کا، دکانداروں کی گونجتی آوازیں، مردوں سے زیادہ عورتوں کا ہجوم، ہجوم میں روزہ دار عورتیں، غیر روزہ دار عورتیں، ایک گال کی روزہ دار عورتیں، اپنے شوہر کے ساتھ میں تو کچھ اپنی سہیلیوں کے ساتھ، کچھ پاس پڑوس کی عورتوں کے ساتھ، نقاب کی پٹی اٹھا کر شربت پیتے مرد عورتیں، دکان کی آڑ میں کھاتے پیتے شوہر بیوی، کشمیری چائے، کباب پراٹھے کی دوکانیں، ہوٹلوں پر بھوکے لوگوں کی بھیڑ، بھیڑ میں بھیک مانگتے بھکاری، جیب کترے اور چور اپنی اپنی روزی روٹی میں مصروف۔یہ نظارہ عام طور پر رمضان کے مہینے میں بازاروں کا ہوتا ہے۔

رمضان کی آمد اور ترکاری ترک۔گوشت کی دکانوں پر خریداروں کی بھیڑ۔ایک کلو گوشت اور آدھا کلو قیمہ۔

حاجی صاحب گوشت کا آرڈر دے کر دکان میں سیمنٹ کی بنی بینچ پر بیٹھ کر تسبیح پڑھنے لگے۔قیمہ ذرا باریک رکھنا اور گوشت میں گردن اور اگلا دست رہے گا، چکنائی بالکل نہیں ہونی چاہئے۔اطمنان رکھئے حاجی صاحب۔ایسا گوشت دیں گے طبیعت خوش ہو جائے گی۔

حاجی صاحب کی تسبیح کا ورد بات کے دوران بھی جاری تھا۔

گوشت ہو گیا حاجی صاحب۔

کتنا پیسہ ہوا؟ پانچ سو پچاس۔۔۔۔۔آپ پانچ سو دے دیجئے۔

حاجی صاحب نے پانچ سو کا نوٹ گوشت فروش کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا عامر بھائی حلال ہے نا؟

ہاں حاجی صاحب گوشت تو حلال ہے کیا آپ کا پیسہ بھی حلال ہے؟ عامر نے فوراً حاجی صاحب سے سوال کر دیا۔

کیوں کوئی شک۔نہیں آپ کی بہن ایک روز قیمہ لینے آئیں تھیں۔

کون سی بہن؟ ارے وہی جن کی شادی میں چھوہارا لوٹنے کو لے کر ہنگامہ ہو گیا تھا۔

اچھا اچھا کیا کہہ رہی تھی۔کچھ نہیں بس یوں ہی باتوں باتوں میں کہنے لگیں۔بھیا صوم صلوٰۃ کے پہلے سے ہی پابند تھے اب تو ماشاءاللہ سے حج بھی کر لیے ہیں۔سماج میں عزت بھی ہے۔لوگوں کو نصیحت بھی دیتے رہتے ہیں۔مسجدوں میں واعظ بھی دیتے ہیں۔باوجود اس کے ہم بہنوں کا حصہ مار لیا۔کہتے ہیں باپ کی زندگی میں لڑکیوں کا جائداد میں حق ہوتا ہے، باپ کے مرنے کے بعد نہیں۔

حاجی صاحب نے دوکان میں گوشت خرید رہے لوگوں پر ایک نظر ڈالی اور بغیر کوئی جواب دیئے نکل گئے۔ ☆☆☆

شونیہ کا رقص

سید تحسین گیلانی

(ایڈیٹر، انہماک ادبی میگزین، لاہور، پاکستان۔ موبائل: +923046474834)

کائنات کے اس آخری سرے پر، جہاں روشنی بھی تھک کر دم توڑ دیتی ہے، وہ ایک برفانی چٹان پر ساکت بیٹھے تھے۔ ان کے گرد وقت کی لہریں آ کر پاش پاش ہو رہی تھیں۔ یہ شنکر تھے۔ ان کے ماتھے پر سجی چاند کی ہلال لکیر سے ایک ٹھنڈی چاندنی پھوٹ رہی تھی، مگر ان کے گلے میں لپٹا ناگ مسلسل کائنات کی گرمی کو اپنے اندر جذب کر رہا تھا۔ اچانک، کائنات کے اس سناٹے میں ایک لرزش پیدا ہوئی۔ دور کہیں ایک ستارہ ٹوٹ کر گرا تھا، اور اس کے ٹوٹنے کی آواز شیو کے کانوں میں ایک سوال بن کر گونجی۔ "مہادیو! آپ ساکت کیوں ہیں؟" یہ آواز وقت کی تھی، جو ایک بوڑھے مسافر کی صورت میں ان کے سامنے کھڑا تھا۔ "نیچے دیکھیے، زمین پر ہاہاکار مچی ہے۔ لوگ بھوک، پیاس اور انا کی آگ میں جل رہے ہیں۔ آپ کی سمادھی کب ٹوٹے گی؟"

شنکر نے اپنی آنکھیں نہیں کھولیں۔ ان کے لبوں پر ایک ایسی مسکراہٹ ابھری جو نہ خوشی کی تھی نہ غم کی، بلکہ محض ہونے کی تھی۔ "میں ساکت نہیں ہوں، مسافر،" شیو کی آواز فضا میں بکھر گئی۔ "جسے تم میرا سکون سمجھ رہے ہو، وہ دراصل میری انتہائی تیز رفتار حرکت ہے۔ جب لٹو اپنی پوری رفتار سے گھومتا ہے، تو وہ ساکت نظر آتا ہے۔ میری سمادھی ہی اس کائنات کا محور ہے۔ اگر میں حرکت میں آ گیا، تو یہ سب بھسم ہو جائے گا۔"

مسافر نے حیرت سے دیکھا۔ "تو کیا آپ کچھ نہیں کریں گے؟" شیو نے دھیرے سے اپنی تیسری آنکھ (تریتیا نیتر) کی جگہ پر ہاتھ رکھا۔ "لوگ مجھ سے تباہی مانگتے ہیں یا پناہ۔ مگر کوئی یہ نہیں مانگتا کہ وہ خود کو 'شونیہ' (خالی پن) کر لے۔ دیکھو!" انہوں نے اپنا ڈمرو اٹھایا اور ایک ہلکی سی ضرب لگائی۔ اس آواز سے کائنات کے ذرے ذرے میں ایک ارتعاش پیدا ہوا۔ ہر انسان کے دل کے اندر ایک دھڑکن پیدا ہوئی، جو اسے یاد دلا رہی تھی کہ وہ مٹی ہے اور اسے مٹی میں ہی ملنا ہے۔ "میرا رقص (تانڈو) باہر نہیں، اندر ہوتا ہے،" شیو نے کہا۔ "میں ہر اس جگہ موجود ہوں جہاں پرانی سوچ مرتی ہے اور نیا خیال جنم لیتا ہے۔ میں وہ زہر ہوں جو انسان اپنی انا کی خاطر پیتا ہے، اور میں ہی وہ راکھ ہوں جو سب کچھ ختم ہونے کے بعد باقی بچتی ہے۔" اچانک شنکر کھڑے ہو گئے۔ ان کے پیروں کے نیچے زمین نہیں تھی، بلکہ کہکشاؤں کا ایک قالین تھا۔ انہوں نے رقص شروع کیا۔ یہ وہ رقص تھا جس میں قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے، بلکہ خلا میں پڑ رہے تھے۔ ہر قدم کے ساتھ ایک پرانی دنیا مٹ رہی تھی اور ہر ہاتھ کے اشارے (مدرا) کے ساتھ ایک نیا سورج طلوع ہو رہا تھا۔

مسافر (وقت) نے دیکھا کہ شیو کے گلے کا زہر اب نیلا نہیں رہا تھا، بلکہ وہ کائنات کی تمام سیاہی کو پی کر نور بن چکا تھا۔ "میں شنکر ہوں،" رقص کی گونج میں آواز آئی۔ "میں وہ خلا ہوں جسے تم بھرنا چاہتے ہو، اور میں وہ بوجھ ہوں جسے تم اتارنا چاہتے ہو۔ جو مجھ میں فنا ہو گیا، وہ امر ہو گیا۔" جب رقص تھما، تو وہاں نہ مسافر تھا، نہ چٹان تھی، اور نہ ہی کوئی سوال۔ صرف ایک نیلی روشنی تھی جو کائنات کے ہر کونے میں پھیل چکی تھی۔ شیو دوبارہ اپنی سمادھی میں لین ہو چکے تھے، مگر اب کائنات کے ہر ذرے میں ان کے ڈمرو کی تھاپ گونج رہی تھی۔ کائلاش کی اس برفانی خاموشی میں، جہاں صرف مہادیو کی سانسوں کی بازگشت سنائی دیتی تھی، اچانک ایک سحر انگیز آہٹ ہوئی۔ یہ ماتا پاروتی تھیں، کائنات کی تخلیقی توانائی، یعنی "شکتی"۔ وہ شنکر کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئیں، ان کا روپ جتنا کومل تھا، ان کی آنکھوں میں چھپی طاقت اتنی ہی بے پناہ تھی۔ "سوامی!" پاروتی کی آواز نے برف کی تہوں میں زندگی بھر دی۔ "آپ کی یہ ابدی سمادھی ادھوری ہے۔ کائنات پکار رہی ہے۔ مٹی پیاسی ہے اور روحیں بے چین۔ کیا آپ صرف 'انت' (خاتمہ) کے منتظر رہیں گے؟"

شنکر نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ ان کے جٹا جوٹ (بالوں) میں ایک اضطراب پیدا ہوا۔ اچانک، ان کے بالوں کی گہرائیوں سے ایک سفید دودھیا دھارا پھوٹی اور شور مچاتی ہوئی باہر نکلی۔ یہ گنگا تھی، آکاش سے اتری ہوئی وہ لہر جو اپنے ساتھ کروڑوں سالوں کا شعور اور پاکیزگی لیے ہوئے تھی۔

"میں بہنا چاہتی ہوں، مہادیو!" گنگا کی آواز میں ایک تیکھا پن تھا۔ "مجھے زمین کی پیاس بجھانی ہے، مجھے پاپ دھونے ہیں، مگر میری رفتار اتنی ہے کہ میں زمین کو چیر دوں گی۔ مجھے پناہ دیجیے!"

شنکر مسکرائے۔ انہوں نے اپنی جٹاؤں کو کھول دیا اور گنگا کی پوری سرکشی کو اپنے بالوں میں قید کر لیا۔ گنگا، جو آسمان کو لرزا رہی تھی، شیو کے لمس سے ایک دھیمی اور پرسکون ندی بن کر ان کے قدموں سے بہنے لگی۔ "دیکھو پاروتی،" شیو نے کہا۔ "گنگا شعور ہے، جو جب تک قابو میں نہ ہو، تباہی لاتا ہے۔ اور تم شکتی ہو، جو اگر خاموش ہو جائے تو کائنات جم جائے۔"

پاروتی نے مسکرا کر اپنا ہاتھ بلند کیا۔ "تو پھر سوامی، آج رقص ہو جائے۔ ایسا رقص جہاں "مرد" اور "پرکرتی" (قدرت) ایک ہو جائیں۔" تب شروع ہوا وہ رقص جسے کائنات نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ایک طرف شنکر کا طاقتور "تانڈو" تھا جو پرانی دنیا کی راکھ اڑا رہا تھا، اور دوسری طرف پاروتی کا "لاسیہ" (نرم رقص) تھا جو اس راکھ سے نئے پھول کھلا رہا تھا۔

گنگا ان کے گرد ایک حصار بن کر بہہ رہی تھی، جیسے وقت کی لہریں ان کے رقص کی تال پر ناچ رہی ہوں۔ گنگا کے پانی میں وہ تمام کہانیاں بہہ رہی تھیں جو گزر چکی تھیں، اور پاروتی کے قدموں تلے وہ تمام کلیاں مسکرا رہی تھیں جنہوں نے ابھی جنم لینا تھا۔

"میں ادھورا ہوں تمہارے بغیر،" شیو نے رقص کے دوران پاروتی سے کہا۔ "میں شیو ہوں، مگر تمہارے بغیر میں شَو (مردہ) ہوں۔ تم حرکت ہو، میں سکون ہوں۔ تم رنگ ہو، میں روشنی ہوں۔"

گنگا کی لہروں نے اس بات کی گواہی دی۔ فضا میں ایک ایسی ہم آہنگی پیدا ہوئی کہ پہاڑ موم ہونے لگے۔ زہر اور امرت، آگ اور پانی، زندگی اور موت، سب ایک دوسرے میں ضم ہو گئے۔

جب رقص تھما، تو کائلاش پر پھر وہی ابدی سکوت چھا گیا۔ مگر اب یہ سکوت موت کا نہیں تھا، بلکہ ایک نئی زندگی کی تمہید تھا۔ شنکر کے جٹاؤں سے گنگا اب بھی دھیمے دھیمے بہہ رہی تھی، اور ماتا پاروتی ان کے ماتھے پر لگی راکھ کو اپنے آنچل سے صاف کر رہی تھیں۔

کائنات اب شونیہ (خالی) نہیں تھی، وہ "پورن" (مکمل) ہو چکی تھی۔

☆☆☆

افسانچہ

بِٹیا رانی

ابراہیم نثار اعظمی

لکھنؤ۔ موبائل: 9036744140

آہ اوہ میرے خدایا مجھے اس مصیبت سے نکال دے۔ شبانہ اس کی ہتھیلی کو سہلا رہی تھی۔ شکیلہ کی رونے کی آواز بار بار اٹھ رہی تھی اسپتال کی ساری نرسیں پریشان ادھر سے اُدھر ہو رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے پیدائش ہو گئی۔ اس بار بھی اسے بیٹی ہوی۔

یہ خبر اسپتال کے کمرے میں گونجنے کے بعد گھر والوں پاس پہونچی تو ایک بار پھر سارے خانوادے کے چہرے پر پیڑیان پڑ گیں۔ ہر کسی کو بہت تکلیف ہوئی کہ شکیلہ کو یہ پانچویں بیٹی ہوی ئی۔ اس بار ہارون سے لے کر ماں باپ بھائی بہن ہر کسی کو یہ امید تھی اس بار شکیلہ کو بیٹا ہوا ہوگا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ دو تین کے بعد اسپتال سے چھٹی ہو گئی۔ اب شکیلہ گھر آ چکی تھی۔ گھر میں اگر سب سے زیادہ تکلیف ہوئی تو وہ تھی شکیلہ کی ساس۔ ساس کو بھی اس بار پوتے کی خواہش تھی۔ ہارون تو پہلے ہی سے یکے بعد دیگرے چار بیٹی ہونے پر چھ مہینہ سے گھر چھوڑ دیا تھا۔ بڑی مشکل سے شکیلہ کے گھر والے اس کا دوا علاج کرائے۔ ساس گھر میں ہوتے ہوے بھی کبھی اس کی طرف نہیں دیکھتی تھی۔ ہر وقت لعن طعن کرتی رہتی۔

کل موہی پتہ نہیں کہاں سے آئی ہے؟ بیٹی پر بیٹی کی لائن لگاتی جا رہی ہے۔ بھلا ایسا بھی کوئی کرتا ہے۔ وہ دیکھو اپنا پڑوس کا جبار اس کے تو چھ بیٹے ہو گئے۔ کتنا خوش ہے اس کا خاندان۔ ایک تو ڈائن ہے۔ تمہیں تو ذرا بھی عقل نہیں کی جا کر حکیم صاحب سے کچھ نسخہ لے لے۔ یہ سب بات شکیلہ گھر کے آنگن مین بیٹھی اپنی بیٹی کو پیار کرتے ہوے سن رہی تھی۔ اور دل ہی دل میں یہ گمان بھی کر رہی تھی کہ یہ سماج ہو گیا ہے ایک عورت ہی ایک عورت کو نہیں دیکھنا چاہتی ہے۔ مرد تو کبھی کو سمجھے نہیں پر اس سماج کو اب کیا ہو گیا ہے عورت ہی عورت کی دشمن بنی بیٹھی ہے اب اللہ نے مجھے بیٹی جیسی نعمت سے نوازتا ہے مجھے تو کوئی تکلیف نہیں لیکن ان لوگوں کو میری بیٹیوں سے اتنی تکلیف کیوں ہے؟ اس میں میرا کیا قصور؟ شکیلہ اپنے انچل سے منھ کو چھپا کر روئے جا رہی تھی۔ ☆☆☆

کتاب کا نام	:	شیشے کے اس پار (افسانوی مجموعہ)
تخلیق	:	ڈاکٹر عافیہ حمید
مبصر	:	اُمّ ایمن
		(ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو
		خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ)
قیمت	:	۳۰۰/روپے صفحات : ۱۶۷
اشاعت	:	۲۰۲۵ء
ناشر	:	ایم۔آر پبلیکیشنز، نئی دہلی

افسانہ ایک مؤثر ومقبول صنف ادب ہے جو انسانی جذبات، احساسات، نظریات، نفسیات، سماجی مسائل ومصائب کے نشیب وفراز اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نہایت اختصار مگر بھرپور تاثیر کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ ہر افسانہ گویا ایک مکمل کائنات ہے جس میں زندگی کے حقائق آئینے کے مانند قاری کے سامنے بے نقاب ہوتے ہیں۔ زیر نظر افسانوی مجموعہ ''شیشے کے اس پار'' بھی اسی ادبی روایت کا ایک دل کش نمونہ ہے۔ اس میں شامل کہانیاں صرف دلچسپی کا سامان نہیں بلکہ قاری کو غور وفکر اور اندرون ذات کی طرف متوجہ کرنے پر بھی مجبور کرتی ہیں۔

'' شیشے کے اُس پار'' مصنفہ کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ افسانوی مجموعہ 167 صفحات پر مشتمل ہے جو مطبع ایچ ایس پرنٹرز، ایم۔آر۔ پبلیکیشنز نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کی قیمت 300 روپے ہے۔ کتاب کے ابتدا میں پیش لفظ کے علاوہ افسانوی مجموعے سے متعلق پروفیسر عبد الحمید، پروفیسر احمد محفوظ، ڈاکٹر اعظم انصاری، ڈاکٹر ہارون رشید اور عمر فراہی کی تجزیاتی آراء شامل ہیں۔ کتاب کا خوبصورت سرورق قارئین کو پہلی نظر میں اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ تخلیق کا فن ڈاکٹر عافیہ حمید کو والد پروفیسر عبد الحمید سے وراثت میں ملا۔ مصنفہ نے عالمیت و فضیلت کی سند حاصل کرنے کے علاوہ لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے اور خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ سے '' آزادی سے قبل اردو افسانوں میں نسوانی کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند بھی حاصل کی ہے۔

زیر نظر افسانوی مجموعہ شیشے کے اُس پار میں کل پچیس افسانے شامل ہیں۔ جس میں مصنفہ نے دور حاضر کے درپیش مسائل کو بڑی بے باکی سے موضوع گفتگو بنایا ہے۔ مجموعے میں شامل تقریباً تمام افسانے مختصر مگر مؤثر اور حالات حاضرہ کے تقاضے کے مطابق ہیں۔ ان افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ قاری ان میں ایسا کھو جاتا ہے کہ ایک افسانہ ختم ہوتے ہی اگلے افسانے کی ورق گرادنی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ زیر تبصرہ افسانوی مجموعے کے تمام افسانوں کے کردار عموماً ہمارے زمانے کے جیتے جاگتے کردار محسوس ہوتے ہیں۔ ان افسانوں میں مصنفہ نے مفلسی، فرقہ وارانہ فسادات، کورونا وبا، نوٹ بندی، خواتین کے مسائل، تعلیمی و گھریلو زندگی کے مسائل، پڑھے لکھے بے روزگار، جنسی اور ہم جنس پرستی جیسے اہم اور عام معاشرتی موضوعات پر قلم اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر عافیہ حمید کا اسلوب نگارش، زبان و بیان سادہ، سلیس، عام فہم، رواں اور مؤثر ہے۔ انہوں نے کم الفاظ میں اپنے افسانوں کے ذریعے قارئین تک اپنی بات پہچانے کی کوشش کی ہے۔

افسانہ ''شیشے کے اس پار'' میں سرکاری محکمے کے غیر ذمہ دارانہ رویے کو بڑی چابک دستی سے نشانہ بنایا گیا ہے۔ ایک بے گناہ کو ایک عرصے تک جیل میں رکھنے کے بعد باعزت رہا کیا جاتا ہے، اور جب اس کا قید سے رہائی کا وقت آتا ہے تو اس کی بیوی اس کا انتظار کرتے ہوئے اس دنیا سے آزاد ہو چکی ہوتی ہے۔

اسی طرح افسانہ ''شکرانہ'' میں راوی اپنی کھڑکی سے پڑوسی کی بیوی کے تمام کام کرتے ہوئے دیکھ کر اس کی قسمت پر نازاں ہوتی ہے اور اپنے حالات پر دل ہی دل میں اپنے خاوند کی لعنت و ملامت کرتی ہے۔ لیکن راوی اس وقت حیران ہو جاتی ہے جب وہ حقائق سے باخبر ہوتی ہے اور اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر اپنی شکایت پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے بارگاہ خداوندی میں شکرانہ پیش کرتی ہے۔ اس افسانے کے آخری جملے کچھ یوں ہے:

> ''قبل اس کے کہ میری کچھ سمجھ میں آتا، اُس کے ہم سفر نے اُس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں پکڑا دیا اور ایک لمحے کو لگا میں چیخ پڑوں گی۔ میرے ہاتھ میں اُس کے ہاتھ کے بجائے اُس کی بلیک کوٹ کی آستین تھی۔ میں نے غور سے اُس کے شانوں کی طرف دیکھا۔ اُس کے خوبصورت بال بے نیازی سے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور کوٹ کی دونوں آستینیں لٹکی ہوئی تھیں۔ اُس کی بوڑھی

آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ میں نے اسی وقت اپنے دونوں
ہاتھ دعا میں اُٹھا لیے۔ آج آنسو شکایت کے نہیں تھے بلکہ
ندامت اور شکرانے کی آمیزش کے تھے۔''

اس کے علاوہ اس مجموعے میں شامل افسانے کاغذ کی روٹی، مکھوٹا، موت پری، اسکارف پن، سند یافتہ وغیرہ دلچسپ افسانے ہیں۔ افسانے کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ تخلیق کار اپنے مطلب کی بات کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے اور فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیتا ہے۔ قارئین اپنی بصیرت کے مطابق اسے سمجھ کر اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔ یہ خصوصیت بھی اس مجموعے کے افسانوں میں نمایاں نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر عافیہ حمید کا یہ افسانوی مجموعہ قارئین کے دل و دماغ پر اثر انداز ہونے میں کافی حد تک کامیاب نظر آتا ہے۔ انہوں نے صارفی کلچر کے بڑھتے ہوئے رجحان اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل و مصائب کے علاوہ تبدیل جنس و جنسی مسائل کو موضوع بحث بنایا اور ایسے سماجی موضوعیات پر قلم اٹھانے کی کوشش کی ہے جس پر عموماً بہت کم لوگ ہی لکھنے کی ہمت کرتے ہیں۔ ان افسانوں کے ذریعے انہوں نے دور حاضر کے ابھرتے افسانہ نگاروں میں اپنا نام درج کروایا ہے اور اردو افسانے کو نئی سمت عطا کرنے کا میاب کوشش کی ہے۔

''شیشے کے اس پار'' نہ صرف ایک افسانوی مجموعہ ہے بلکہ آج کے معاشرے کی سچی تصویر کشی ہے، جس میں مصنفہ نے عام انسانوں کی زندگی سے جڑے پیچیدہ مسائل کو بڑی سادگی اور گہرائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر عافیہ حمید کا یہ افسانوی مجموعہ ان کے فکری شعور، فنی پختگی اور سماجی بیداری کا واضح ثبوت ہے۔ ان کا اسلوب رواں، زبان سادہ اور مشاہدہ گہرا ہے جو قاری کو نہ صرف افسانوں سے جوڑے رکھتا ہے بلکہ انہیں دیر تک سوچنے اور غور و فکر کرنے پر بھی مجبور کرتا ہے۔ یہ مجموعہ مصنفہ کی پہلی کاوش ہے اس لئے اس میں فنی پختگی ابتدائی مراحل میں ہے، لیکن اس کے باوجود اس میں موجود سادگی، بیان کی روانی اور تخلیقیت اس بات کی دلیل ہے کہ وقت کے ساتھ ان کی تخلیقات اور اسلوب مزید پختہ ہوتا جائے گا۔ یہ مجموعہ اردو افسانے کی روایت میں ایک خوبصورت اور معنی خیز اضافہ ہے امید ہے کہ مصنفہ کا یہ تخلیقی سفر اسی طرح باوقار انداز میں آگے بڑھتا رہے گا۔

☆☆☆

کتاب کا نام	:	والد کے خطوط بیٹے کے نام
مرتب	:	حاجی سید مفید الدین قادری
مبصر	:	ساجد خیر آبادی
قیمت	:	۳۵۰/روپئے صفحات : ۳۰۰

حاجی سید محمد مفید الدین قادری کی جوہر شناسی کے باعث 167 خطوط پر مشتمل 300 صفحات کی کتاب عمدہ دیدہ زیب سرورق سے آراستہ بعنوان 'والد کے خطوط بیٹے کے نام' میرے پیش نظر ہے۔ جس میں مرتب کتاب حاجی سید مفید الدین قادری نے اپنے جد امجد حضرت سید الحاج قادری مولانا پنڈت محمد بشیر الدین قادری شاہجہاں پوری (جو ہندوستان کے معتبر اور مستند علمی و مذہبی سماجی شخصیت تھے جن کی قابلیت سے متاثر ہو کر حکومت ہند نے پنڈت کے خطاب سے نوازا تھا نیز قومی اعزاز نیشنل ایوارڈ بھی بدست صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد عطا کیا گیا تھا) کے قابل قدر خطوط جو انہوں نے اپنے لائق وفائق فرزند مرتب کتاب کے والد ماجد سید مولانا محمد معز الدین قادری شاہجہاں پوری کو تحریر کیے تھے، ان خطوط کو یکجا کر کے کتابی شکل میں منظر عام پر لا کر ایک عظیم الشان علمی و ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔ مرتب نے کتاب کا انتساب اپنی والدہ ماجدہ حضرت حجن سیدہ خاتون قادری کے نام کیا ہے۔ کتاب میں مرتب کے مضمون کے علاوہ جناب تسلیم غوری بدایونی اور جناب رونق مصور عارفی کے مضامین شامل ہیں۔ جن میں مکتوب نگار کی تاریخ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مکتوب نگار حضرت سید الحاج قاری پنڈت محمد بشیر الدین قادری شاہجہاں پوری رحمت اللہ علیہ اور مکتوب علیہ حضرت الحاج سید مولانا محمد معز الدین قادری شاہجہاں پوری رحمت اللہ علیہ کی شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے جو مذکورہ کتاب کے وقار میں اضافہ کا سبب ہے۔

مندرجہ بالا کتاب کے صفحہ 158 پر مکتوب نگار کی تحریر کردہ یہ عبارت کہ جب مخدومنا حضرت سالم میاں نے ہزارہا کہ مجمع میں حضور غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کے ارشاد گرامی کے مطابق اس ناچیز کو خرقہ خلافت عطا فرمایا نیز صفحہ 162 اور 163 پر مکتوب نگار نے بذریعہ تحریر اپنے وہ خواب بیان کیے اور خواب میں مناسک حج ادا کرتے ہوئے خود کو دیکھا نیز دوم خواب میں مکتوب نگار نے خود کو ایک لق و دق میدان میں کثیر مجمع کے ساتھ کھڑا دیکھا اور اسی میدان میں ایک وسیع و عریض عمارت کے چار دیواری کے اندر سرسبز و شاداب باغات بھی

دیکھے مزید یہ بھی دیکھا کہ کسی نے اچانک آ کر کنجیوں کا ایک گچھا مکتوب نگار کے سیدھے ہاتھ میں دے دیا اور کہا کہ اس کو احتیاط سے رکھنا یہ جنت کی کنجیوں کا گچھا ہے۔مکتوب نگار نے صبح شہر کے دیندار حضرات سے اپنا خواب بیان کیا۔ان حضرات نے خواب کو دینی اور دنیوی اعتبار سے صحیح تعبیر کرتے ہوئے مبارکباد پیش کی، یہ خواب مکتوب نگار کی قابل قدر شخصیت کا حسین پہلو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ مکتوب نگار کی پاکیزہ خیالی درجات کی بلندی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

مندرجہ بالا کی کتاب کے صفحہ 28 پر مکتوب نگار اپنے لائق وفائق بیٹے کی ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں: تمہیں خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نیز اولیائے امت کی زیارت نصیب ہوئی مبارک ہو، مکتوب الیہ کے مقام ومراتب کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ خواب میں آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں شیطان شیطان نہیں آسکتا۔پیش نظر کتاب میں شامل خطوط اس بات کا مظہر ہے کہ مکتوب نگار نے اپنے نور نظر حضرت الحاج سید مولانا محمد معزالدین قادری شاہ جہاں پوری کو اپنے خطوط کے ذریعے دوظائف کی تلقین کی جیسا کہ وہ اپنے ایک خط مورخہ 14 مارچ 1967 میں تحریر فرماتے ہیں سورہ ملک کی تلاوت بعد نماز عشاء جاری رکھو، پنج سورۃ کی تربیت قادریہ سلسلہ میں یہ ہے۔

فجر میں سورہ یاسین شریف، ظہر میں سورہ نوح شریف، عصر میں سورہ عمایتساءلون، مغرب میں سورہ واقعہ اور نماز عشاء کے بعد سورہ ملک شریف ملاحظہ فرمائیے صفحہ نمبر 18 دسمبر 1971 میں کے خط میں تعریف فرماتے ہیں روزانہ ایک تسبیح استغفر اللہ ربی من کل ذنبی وتوب علیہ پڑھتے پڑھتے رہو اول و اخر درشریف ایک ایک بار ملاحظہ فرمائیے سورہ صفحہ 74 مزید 19 دسمبر 1878 میں توبہ استغفار پڑھنے کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں علاوہ عظیم مکتوب نگار نے مکتوب علیہ کو اپنے خط میں بعد نماز عشاء حصار کھینچ کھینچ کر سونے کی ترقی کرتے ہوئے حصار کھینچنے کا طریقہ تعریف فرمایا ہے تفسیر ملاحظہ فرمائیے حضرت سید الحاج قاری مولانا پنڈت محمد بشیر الدین قادری شاہ جہاں پوری نے اپنے مختلف اپنے خالف الرشید حضرت الحاج سید مولانا محمد معذالدین قادری کو اپنے ختم اور 24 فروری 1970 میں مصطفی انداز میں تعریف فرماتے ہیں اللہ تعالی تمہیں بیت اللہ شریف کے عوض کے فائض وبرکات مبارک کرے اور ہم سب کو بھی تمہارے ذریعے سے اس کی برکتوں سے مالا مال کرے اسی ختم مزید یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ مکہ معزمکہ معظّمہ کے قیام کے دوران نفلی عمرہ اور طواف جاری رکھو وہاں یہ سب سے بڑی عبادت ہے حتی کہ تلاوت کلام پاک سے بھی بڑھ کر نیزم اور خسات مارتو 1970 کے خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ کوشش کر کے جلد مدینہ شریف چلے اؤ جاؤ تا کہ وہاں اٹھ دن سے زیادہ قیام کرنے کا موقع مل جائے مورخہ 14 ماہ 1970 کو تحریر فرماتے ہیں کہ اپنی والدہ محترمہ کے پیش خدمت کر کے دعائیں لیتے رہو یہ سعادت کسی نصیب ہوتی ہے یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ وہ خدمت کر کے جنت کے مستحق بن گئے ایک مومن کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے اللہ مبارک کرے امین مکتوب نگار کی تحریر کرتا مندرجہ بالا سطور عاصمین حج کے لیے ماشاءاللہ راہ ہونے کے ساتھ ساتھ مکتوب علیہ کی رہنمائی کرتے ہوئے مکتوب علیہ کے لیے سند کا درجہ رکھتی ہے مکتوب نگار نے اپنے خطوط کے ذریعے احباب اباب المومنین کی مہر کی تفصیل نیز محرفاتمی کی تفصیل ہل سے بھی اپنے لخت جگر کو اگاہ کیا ہے ملاحظہ فرما صفا 241 انسان کے چاند پر اترنے کے متعلق مکتوب نگار مکتوب علیہ کو یکم اگست 1969 کے خط میں ایات قرانی کی روشنی میں تحریر فرماتے ہیں کہ چاند کی تسخیر کا مسئلہ صاف ہے قران کریم میں انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا شرف بکتا گیا ہے کائنات عالم کے کی ہر چیز انسان کے لیے بنائی گئی ہے خلق خلق کے جن وہی سے ال بعید دن جب یہ طے شدہ امر ہے تو پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے یہ اج انسان چاند پر اترنے اور کل کسی اور پر قمر شمس وال قمر کلام پاک میں کی نہایت واضح ایت ہے یعنی چاند اور سورج کو مسخر کر دیا گیا ہے مندرجہ بالا کتاب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتا ہے کہ مکتوب نگار نے مکتوب علیہ کے کو صرف اپنی معاملات سے ہی اپنے خطوط کے ذریعے روشناس نہیں کرایا بلکہ دنیاوی معاملات میں بھی بذریعہ خطوط باخبر کیا جیسا کہ مورخہ اٹھ اگست 1969 کے ختم مکتوب نگار نے 12 مہینوں کی ممنوعہ چیزوں کو تفصیل سے تحریر کیا ہے ملاحظہ فرمائے صفحہ 35 خیر 24 فروری 1970 کے ختم میں عمرہ کا ذکر کیا ہے کہ عمرہ انکھوں کے لیے مفید ہے ملاحظہ فرمائے صفحہ 48 مجلس 26 نومبر 1978 کے قدمی طیب فرماتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں ایک خط خرو خاص فرائی نام کی ہوتی ہے جو عورتوں کے لیے مفید ہے مجموعی طور پر مندرجہ بالا کتاب میں شامل خطوط کے متعلق کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ حضرت سید الحاد قاری مولانا پنڈت محمد مشہور الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ کے خطوط جو انہوں نے اپنے لخت جگر حضرت الحاج سید محمد معزدین قادری کے نام تحریر کیے ہیں، وہ خط بہترین طرز تحریر ہے سیاہ راستہ وپہ راستہ دینی و دنیاوی معلومات کا اہم جز، مکتوب نگاری کا قیمتی سرمایہ ہے جن کا مطالعہ رہبران علم وادب کے لیے مشعل راہ ہوگا۔

کتاب کا نام	:	خوشبوئے ریحان
تالیف	:	ڈاکٹر ریحان احمد قادری
مبصر	:	انس مسرور انصاری
		(جلالپور، امبیڈکر نگر، 9453347784)
قیمت	:	۲۰۰/روپے صفحات : ۱۸۰
اشاعت	:	۲۰۲۳ء
ناشر	:	دربھنگہ ٹائمز پبلی کیشنز، پرانی منصفی، دربھنگہ

صوبہ بہار میں اُردو زبان کی ابتداء، اُس کی نشوونما، اُس کی ترویج واشاعت اور علمی وادبی تحریکات کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس سرزمین نے ایسے ایسے گل ولالہ اور گلہائے رنگارنگ کھلائے جن کی مثالیں کم یاب ہیں۔ اُسی فہرست میں ڈاکٹر ریحان احمد قادری کا نام بھی روشن حروف میں درج ہے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ تعلیم وتعلم اُن کے مشاغل ہیں۔ وہ پروفیسر ہیں اور اس منصب پر فائز ہیں جہاں سے خدا کے بخشے ہوئے علوم کونئی نسل میں منتقل کیا جاتا ہے۔ خداوند کریم نے اپنے محبوب رسول ﷺ کو معلم بنا کر مبعوث فرمایا۔ اس منصب سے بڑا کوئی منصب نہیں۔ ڈاکٹر ریحان احمد قادری کی نئی کتاب ''خوشبوئے ریحان'' پیش نظر ہے۔ اس کتاب کی محطویات میں اکیس مضامین ہیں جن کے عنوانات سے کتاب کی اہمیت وافادیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اُن کے موضوعات مختلف النوع ہیں جو اُن کی علمی لیاقت کا آئینہ ہیں۔ کتاب کے دیباچہ یعنی پیش لفظ کے تحت وہ ادب کا تعارف یوں کراتے ہیں:

> ''ادب عربی زبان کا لفظ ہے جو مختلف النوع مفہوم کا حامل ہے۔ اسلام کے ظہور سے قبل عربی زبان میں ضیافت اور مہمانی کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ دور جدید میں ادب کے معنی مخصوص قرار دیئے گئے ہیں اور ادب کے لیے ضروری ہے کہ اس میں تخیل اور جذبات ہوں ورنہ ہر تحریری کارنامہ ادب کہلا سکتا ہے۔ خواہش انسان کی فطرت ہے۔ اسی جبلّی خواہش سے آرٹ پیدا ہوتا ہے۔ آرٹ اور دوسرے علوم میں یہ فرق ہے کہ اس میں کوئی مادّی نفع مقصد نہیں ہوتا ہے۔ یہ بے غرض مسرت ہے جو انسان کو وقت بہ وقت حاصل ہوتی رہتی ہے۔ ادب آرٹ کی ایک شاخ ہے جسے ''فنِ لطیف'' بھی کہتے ہیں۔''

''خوشبوئے ریحان'' ڈاکٹر ریحان احمد قادری کی پانچویں تصنیف ہے اور بلاشبہ قابلِ ستائش وتحسین ہے۔ سال دو ہزار سترہ میں (2017) پہلی مرتب کردہ کتاب ''جنگِ آزادی کے نغمے'' دو ہزار بیس میں (2020ء) مضامین کا مجموعہ ''نگارستانِ ریحان'' دو ہزار اکیس میں (2021) ''ڈاکٹر احسان عالم: ادب کا آئینۂ خوش رنگ'' دو ہزار بائیس (2022) میں ''عطا عابدی کی شعری جہات پر مبنی کتاب ''شعر وشناخت'' منظرِ عام پر آئی۔ پانچویں کتاب ''خوشبوئے ریحان'' کے مطالعہ سے منکشف ہوتا ہے کہ خود اُن کی فکری جہات پر بھی کافی کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ کتاب علم وادب کا ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں رنگ رنگ کے پھول اپنی خوشنما بہاریں دکھا رہے ہیں اور اُن کی جانفزا خوشبوئیں طبعِ لطیف کو فرحت بخش رہی ہیں۔ ماضی وحال کے مختلف ادیبوں اور شاعروں کے مختصر سوانحی خاکے اور ان کی نگارشات پر گہری بصیرت کے ساتھ متوازن اظہارِ خیال آسان کام نہیں۔

کتاب میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی خدمات پر ایک نظر،، بہت عمدہ اور لائقِ مطالعہ مضمون ہے۔ ڈاکٹر جان کی اردو خدمات کا اعتراف ہمیشہ کیا جاتا رہے گا۔ فنیشور ناتھ رینو اور مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کا جائزہ بھی خوب سے خوب تر ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ریحان احمد قادری نے جس موضوع پر بھی قلم اُٹھایا اُسے تشنہ نہیں چھوڑا۔ اُن کی بصیرت نگاہی نے ہر موضوع کو تابندہ وتابناک آئینہ بنایا ہے۔ وہ صالح اور تعمیری ادب کے علم بردار ہیں۔ اُن کی محنت اور عرق ریزی کا اعتراف ناگزیر ہے۔ اُن کے مضامین جہاں اتنی ساری خوبیاں رکھتے ہیں وہیں قاری کو یہ شکایت بھی ہے کہ اُنھوں نے اپنی لسانیات پر خصوصی توجہ نہیں کی۔ اُن کی فکری بصیرت اور شعوری جہد وعمل بلاشبہ تحسین طلب ہیں تاہم موضوعات کو مطلوب لفظیات اور طرزِ اظہار پر کلام کرنا محال نہیں۔ اس کے باوجود ''خوشبوئے ریحان'' ایک ایسی کتاب ہے جس سے طلباء واساتذہ دونوں یکساں مستفید ہو سکتے ہیں۔ ایک ایسا وسیع کینوس جس پر مختلف رنگوں نے اپنے امتزاج سے خوب سے خوب تر سحر آفرینی کی ہے۔ ایک اہم اور لائقِ مطالعہ تصنیف ہے ''خوشبوئے ریحان''۔ علم وادب کی دنیا میں اس کتاب کی خاطر خواہ پزیرائی پر مصنف کو خلوصِ دل سے مبارکباد۔

☆☆☆



آ گیا اے مومنو پھر ماہِ رمضاں آ گیا
اپنے دامن میں لئے اللہ کی رحمت ہزار
روزہ داروں کے لئے افطار کی نعمت ہزار
نعمتوں میں فضل سے اللہ کے برکت ہزار
باغِ رضواں سے لئے فصل بہاراں آ گیا
آ گیا اے مومنو پھر ماہِ رمضاں آ گیا

فرض کے ہو ساتھ سنت اور تراویح کا خیال
رُکن کوئی چھوٹ جانے کا نہ رہ جائے ملال
ہے پتہ کس کو کہ رہ پائیں گے زندہ اگلے سال
مغفرت کی پھر لئے شمعِ فروزاں آ گیا
آ گیا اے مومنو پھر ماہِ رمضاں آ گیا

ہو سکے جتنی عبادت کیجئے اس ماہ میں
کر سکیں جتنی تلاوت کیجئے اس ماہ میں
روزہ داروں کی ضیافت کیجئے اس ماہ میں
تیس یا انتیس دن کا بن کے مہماں آ گیا
آ گیا اے مومنو پھر ماہِ رمضاں آ گیا

کھل گیا ہے بابِ جنت روزہ داروں کے لئے
حور و غلماں منتظر ہیں شب گذاروں کے لئے
اجر کا ہے یہ مہینہ صبر داروں کے لئے
غم زدوں کے واسطے راحت کا ساماں آ گیا
آ گیا اے مومنو پھر ماہِ رمضاں آ گیا

☆☆☆

ذکاءؔ ابن وحید
(محلہ تپراپور، گورکھپور۔موبائل:8736897248)

Peer-Reviewed Journal
Vol: 09, Issue: 02
March To May 2026

Urdu Quarterly
Adbee Nasheman
Lucknow - 226003

RNI No. UPURDU /2017/74845
Per Copy: 40/-

(دستاویز)

مجاہد آزادی عبداللہ انصاری

گورکھپور ضلع کا قصبہ چوری چوراس وقت تحریک آزادی کی تاریخ کا حصہ بن گیا جب ملک میں گاندھی کی جی کی ایما پر عدم تعاون تحریک چل رہی تھی اسی دوران فروری ۱۹۲۲ء میں مجاہد آزادی عبداللہ انصاری کی قیادت میں ایک ایسا سانحہ پیش آیا جس کی بناء پر گاندھی جی نے عدم تعاون تحریک واپس لے لی تھی چوری چورا میں انگریزوں کے وفادار زمینداروں اور ساہوکاروں کے ظلم واستحصال کے خلاف عبداللہ انصاری نے قرب وجوار کے کاروباریوں ،کاشتکاروں اور پسماندہ طبقے کے لوگوں کو منظم کیا اس کے تحت چوری چورا میں ہر سنیچر کو لگنے والی کپڑوں کی منڈی میں غیر ملکی سامانوں کی خرید وفروخت اور شراب خانوں تک قدغن لگانے کی غرض سے پرامن طور پر جلوس نکالا گیا مگر حالات ایسے پیدا ہوئے کہ رضا کاروں کے پرامن جلوس پر پولیس نے پہلے لاٹھی چارج کیا اور بعد میں گولی چلا دی جس میں مولوی نظر علی بھگوان اور رام کھلاون کی موت ہوگئی باوجود اس کے رضا کار آگے بڑھتے رہے اور پولیس تک پتھر بازی کرتے رہے جب پولیس کی گولی ختم ہوگئی تو پولیس والے جان بچا کر تھانے کے اندر بھاگ گئے اور اندر سے تھانے کو بند کرلیا ۔عبداللہ نے تھانے کی عمارت پر تیل ڈال کر آگ لگادی ۔ جس میں تھانے دار سمیت ۲۲ ر پولیس اہلکار جل کر راکھ ہوگئے صرف ایک سپاہی محمد صدیق بھاگنے میں کامیاب رہا۔ ۲ر جولائی ۱۹۲۳ء کو چالیس سالہ عبداللہ انصاری کے ساتھ ۱۹ ر رضا کاروں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

مجاہد آزادی عزیز گُل پشاوری

ہندوستان کی تحریک آزادی میں علمائے کرام کے ذریعہ چلائی گئی ایک تحریک ریشمی رومال بھی ہے اس تحریک کے ایک سرگرم رہنما مولانا عزیر گُل تھے جو کہ پشاور کے رہنے والے تھے ۔تعلیم حاصل کرنے کیلئے دیوبند آئے اس وقت شیخ الہند ملک کی آزادی کیلئے خفیہ منصوبہ پر کام کررہے تھے اس منصوبہ کے تحت ترکی اور افغانستان کی حکومتوں سے ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں تعاون کیلئے جو حکمت عملی تیار کی گئی اس خفیہ منصوبہ کو ریشمی رومال تحریک کا نام دیا گیا۔اس تحریک میں مولانا عزیر گُل شیخ الہند کے ساتھ ساتھ رہے۔انگریزوں کو جب اس تحریک کا پتہ چلا تو شیخ الہند اور مولانا عزیر گُل اس سے پہلے کہ انگریزوں کے ہتھے چڑھتے حجاز کیلئے روانہ ہوگئے ۔انگریزوں نے شریف مکہ پر شیخ الہند کی گرفتاری کیلئے دباؤ ڈالا تو شیخ الہند روپوش ہوگئے ،مگر مولانا عزیر گُل گرفتار کرلئے گئے اور شیخ الہند کا پتہ بتانے کا دباؤ ڈالا گیا اور نہ بتانے کی صورت میں گولی مارنے کی دھمکی دی گئی لہٰذا شیخ الہند خود باہر آگئے اور اپنی گرفتاری دے دی۔اس خفیہ تحریک میں عزیر گُل خطرناک کاموں کو انجام دینے ، پہاڑی علاقوں کا سفر ہو یا دشوار گذار راستوں پر چلنا ہو اور یا پھر ندی نالوں کو پار کرنا ہو ایسے ہی خطرناک کام عزیر گُل کے ذمہ ہوتا جسے وہ بے حد ذمہ داری سے انجام دیتے اس کے علاوہ پیغام رسانی کا کام اور بھیس بدل کر بلاخوف وخطر کام کو انجام دینے میں ماہر تھے ۔ساڑھے چار برس تک مالٹا میں نظر بندی کے دوران ترکی زبان سیکھی اور قرآن پاک کے حفظ میں وقت گزارتے رہے سو(۱۰۰) برس کی عمر ۱۷ر نومبر ۱۹۸۹ء میں انتقال کرگئے۔

Printed,Published & Prop. By **Ahmad Rashiq at Nomani Press, Baroodkhana,Golaganj, Lucknow**
and Published at 544C/168,Almas bagh,Hardoi Road,Lucknow
Editor: Dr. Saleem Ahmad